اِمام وخطیب

کی

شرعی ومُعاشرتی حیثیت

ڈاکٹر نوراحمد شاہتاز

اِسکالرز اکیڈمی

ڈاکٹر نور احمد شاہتاز

اسکالرز اکیڈمی

نام کتاب	:	امام وخطیب کی شرعی ومعاشرتی حیثیت
مؤلف ومرتب	:	پروفیسر ڈاکٹر نور احمد شاہتاز (کراچی یونیورسٹی)
کمپوزنگ	:	حافظ محمد عابد سعید (موبائل: ۰۳۰۰-۳۳۴۰۹۸۰)
طباعت	:	حافظ عابد پرنٹرز
ناشر	:	اسکالرز اکیڈمی، گلشن اقبال کراچی
طبع جدید	:	دسمبر ۲۰۰۰ء، مارچ ۲۰۰۴ء، جنوری ۲۰۱۱ء
قیمت	:	۲۰۰ روپے

ملنے کے پتے:

ضیاء القرآن پبلی کیشنز، اردو بازار، کراچی

فریدی بک سینٹر، اردو بازار، کراچی

مکتبہ رضویہ، آرام باغ، کراچی

مکتبہ غوثیہ، سبزی منڈی، نزد مرکز فیضانِ مدینہ، کراچی

مکتبہ المدینہ اردو بازار، کراچی

مکتبہ کاروانِ قمر دار العلوم قمر الاسلام سلیمانیہ، کراچی

جمیل برادرز، M-13، کتاب مارکیٹ، اردو بازار، کراچی

مکتبہ قادریہ، داتا دربار مارکیٹ، لاہور

مکتبہ ضیاء القرآن، گنج بخش روڈ، لاہور

گنبد خضریٰ پبلی کیشنز داتا دربار، لاہور

حجاز پبلی کیشنز، داتا دربار، لاہور۔

علامہ غلام نصیر الدین نصیر۔

جامعہ نعیمیہ، گڑھی شاہو، لاہور۔

مکتبہ تنظیم المدارس، جامعہ نظامیہ لوہاری گیٹ، لاہور

مکتبہ ضیائیہ بوہڑ بازار، راولپنڈی

جامعہ قادریہ رضویہ، سرگودھا روڈ، فیصل آباد

مکتبہ مجددیہ سلطانیہ، ملک پلازہ دینہ، ضلع جہلم

دار العلوم حنفیہ بصیر پور، ضلع اوکاڑہ۔

فہرست مضامین

انتساب

جامع مسجد طیبہ پنجاب ٹاؤن' کراچی کے ان نیک سیرت نمازیوں کے نام جنہوں نے گزشتہ ۲۲ سال مسلسل میری اقتداء میں نمازیں ادا کر کے میرے اجر وثواب میں اضافہ کا احسان کیا۔

اور ان نیک طینت مرد وخواتین' سامعین کے نام جنہوں نے اس مسجد کے منبر سے ۲۳ سال تک میری تقریروں اور درسِ قرآن و سنت کو نہایت دلجمعی اور صبر واستقامت کے ساتھ سنا۔ جو اپنی فانی زندگی مکمل کر کے واصل بحق ہو کر حیاتِ ابدی پا چکے ہیں۔

پھر اس مسجد کمیٹی کے ان معزز اراکین و اہل محلہ کے نام جنہوں نے انتہائی بردباری و تحمل سے میری سخت سست اور تند و تلخ باتوں کو برداشت کرتے ہوئے منصب امامت کے اکرام کا ریکارڈ قائم کیا۔

پھر محلہ کے ان نوجوانوں کے نام جو ہر کام پر میرے ساتھ رہے اور جنہوں نے مسجد کا پروگرام بحسن وخوبی چلایا اور کامیاب کیا۔

اللہ ان سب کو دنیا و آخرت میں اجرِ عظیم سے مالا مال فرمائے۔ (آمین)

(نور احمد شاہتاز)

باعث تحریر آنکہ!

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علیٰ سید الانبیاء

وامام الانبیاء والمرسلین، اما بعد!

زیر نظر کتاب کی ترتیب کا محرک شعبہ مساجد وامامت سے ۳۰ سالہ وابستگی ہے۔ اس عرصہ میں بہت سے نشیب وفراز دیکھنے کا موقع ملا۔ متعدد آئمہ مساجد وعلماء کرام کا قرب حاصل ہوا اور متعدد مساجد کمیٹیوں کے حال احوال سے واقفیت ہوئی۔ زمانہ طالب علمی میں مختلف مدارس میں زیر تعلیم رہنے اور وہاں کے ماحول کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ علماء و مشائخ کی کفش برداری نے اس قابل کیا کہ میرا شمار بھی اب زمرہ ائمہ وعلماء میں ہونے لگا ہے۔ میں اس شعبہ کا آدمی نہ تھا مگر میرے والد گرامی علامہ عبدالرحمٰن مہری ایک درویش منش عالم دین تھے ان کی دلی خواہش تھی کہ ان کے تینوں بیٹے عالم ہوں یا کم از کم ان میں سے کوئی ایک تو اس راہ پہ چلے جو ان کی اختیار کردہ راہ تھی۔ انہوں نے ہم تینوں پر باری باری اپنا رنگ چڑھانے کی کوشش کی چنانچہ ادب فارسی میں کریما، نام حق، پند نامہ، گلستان و بوستان تک دونوں بڑوں کو انہوں نے ازبر کرا دی تھیں اور چھوٹے (۱) کو حافظ قرآن بنایا تھا۔ مگر ہوش سنبھالنے اور "پر آ جانے" پر کوئی بھی ان کے آشیانہ پہ نہ رہا اور سب نے اپنی اپنی راہ الگ متعین کی۔ بڑے بھائی معاشی حالات کی مجبوری کی بناء پر جلد ہی ملٹری اکاؤنٹس میں ملازم ہو گئے اور ما بدولت نے میٹرک کرنے کے بعد ڈپلومہ آف ایسوسی ایٹ انجینیر کیا۔ پروگرام کے

۱۔ حافظ ذوالفقار علی شہزاز (بی۔اے)

مطابق اسی فیلڈ میں ترقی کرتے ہوئے انجینئرنگ کرنا تھی۔ مگر ڈپلومہ کرنے کے دوران کچھ عرصہ گولڑہ شریف میں حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب مجدد گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ کے آستانہ عالیہ پر حضرت سید عبدالقادر بغدادیؒ کی صحبت میں رہنے کا موقع ملا جو ایک نہایت متقی، عابد شب زندہ دار اور بلند پایہ روحانی شخصیت کے مالک ولی کامل تھے۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا محض رضائے الٰہی کے لئے تھا اور اوڑھنا بچھونا اطاعت خداوندی تھا ان کی کوئی اولاد نہ تھی مگر وہ شاگردوں کو اولاد سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے ان کی شخصیت پر ان کے شاگرد رشید حضرت علامہ مفتی سید شاہ حسین گردیزی نے روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''آپ کی طبیعت کا میلان تصوف کی طرف بہت زیادہ تھا، رات دن میں بہت کم وقت آرام کرتے، اپنا زیادہ وقت یاد الٰہی میں بسر کرتے، خود حافظ نہ ہونے کے باوجود بے شمار طلبہ کو قرآن کریم حفظ کرایا، کیمیائے سعادت، کشف المحجوب اور ہشت بہشت پڑھنے کے بعد انسان کے ذہن میں جس درویش اور باخدا انسان کا تصور ابھرتا ہے حضرت بغدادی شاہ صاحب قدس سرہ اس کی زندہ مثال تھے۔ وہ بڑے عابد و ساجد تھے، ہر وقت باوضو رہتے، تلاوت قرآن حکیم کے علاوہ اوراد و وظائف کثرت سے پڑھتے، شب بیداری سانس کی طرح ساتھ تھی، اشراق تک خاموش رہتے، نماز باجماعت کی پابندی کرتے، لوگوں کو اللہ اللہ کرنے کی طرف مائل کرتے، ان کی محفل میں بیٹھنے سے خدا یاد آتا وہ خدا کے تھے اور بخدا خدا ان کا تھا۔'' (تجلیات مہر انور، ص ۸۰۰،۸۰۲)

علامہ شاہ حسین گردیزی ان خوش نصیب اہل علم میں سے ایک ہیں جنہیں مجدد گولڑویؒ جیسا مقتدا، قبلہ غلام محی الدین بابوجیؒ جیسا پیشوا اور سید عبدالقادر بغدادیؒ صاحب جیسا مربی استاذ نصیب ہوا، وہ بغدادی شاہ صاحب کے خدمت گاران خاص کے زمرے میں آتے ہیں انہیں شاہ صاحب کا سفر و حضر میں سال ہا سال قرب حاصل رہا انہوں نے شاہ صاحب کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس میں سر مو فرق نہیں نہ سوئی کے ناکے کے برابر غلو یا تعلّی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''حضرت بغدادی شاہ صاحب قدس سرہ، طالبان علم و عرفان سے بڑی محبت کرتے اور اپنے طلبہ کی اتنی خبر گیری کرتے جو اس دور میں والدین سے بھی متصور نہیں ہو سکتی۔ ان کے خورد و نوش، صحت و صفائی، تعلیم و تربیت اور تعمیل احکام شرعیہ پر پوری پوری توجہ دیتے، یہ سارے کام وہ ترغیب و ترہیب سے کرا لیتے۔ ان کی زیر نگرانی رہنے والے طلبہ ان تمام خصائص کے اس طرح عادی ہو جاتے جیسے یہ چیزیں ان کی طبیعت میں داخل ہو چکی ہوں۔''

(تجلیات مہر انور، صفحہ ۸۰۳)

اس بیان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بغدادی شاہ صاحب کس کردار ساز عہد کا نام ہے میں نے ان کی خدمت میں کوئی دو برس کا عرصہ گزارا ہو گا۔ اس عرصہ میں، میں وہاں کیا کرتا تھا بس یوں کہہ لیجئے کہ خمیری روٹی کھاتا تھا اور بس! مگر اس قیام نے زندگی میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور میں انجینئرنگ ترک کر کے ضرب یضرب کی گردانیں رٹنے لگا۔

میرے والد گرامی کو میرے اس فیصلہ پر خوشگوار حیرت اور پر بہار مسرت ہوئی وہ خود جامع مسجد فتح پوری دہلی کے زیر سایہ قائم مدرسہ کے فارغ التحصیل تھے اور اپنی اولاد کو بھی علماء کی جوتیوں میں بیٹھا دیکھنا چاہتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں اس تبدیلی میں ان کی دعاؤں کا اور میرے برادر اکبر(۱) کی حسن تدبیر کا بھی دخل ہے جنہوں نے مجھے سید بغدادی شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔

زمانہ طالب علمی میں، میں نے بہت سے طلبہ کو امام اور اماموں کو خطیب، خطیبوں کو مفتی اور مفتیوں کو علامہ و پیر بنتے دیکھا ہے۔ مساجد میں آئمہ حضرات کے ساتھ اور مدارس میں طلبہ و علماء کرام کے ساتھ انتظامیہ کی بدسلوکی اور اہانت کے واقعات دیکھ دیکھ اور سن سن کر مجھے امامت کے پیشہ سے خوف آتا تھا اور میں سوچا کرتا تھا کہ درسِ نظامی کی تکمیل کے بعد ہر فارغ التحصیل کا سلسلہ معاش امامت و خطابت یا مدرسہ کی تدریس کے علاوہ کچھ اور ہونا چاہیے اور دین کی خدمت فی سبیل اللہ کی جانی چاہیے تاکہ عنداللہ و عندالناس امام و عالم ہر قسم کے مواخذہ سے حتی الامکان بچ سکے۔ میرا سو فی صد پختہ ارادہ تھا کہ امامت کبھی نہیں کراؤں گا۔

اس لئے دوران تعلیم جب بھی کسی مسجد کے متولی یا اراکین، مدرسہ کے مہتمم صاحب کے پاس امام وخطیب کے لئے آتے اور میرا نام زیر غور آتا تو میں معذرت کر لیتا اور اس طرح ایک عرصہ یونہی کام چلتا رہا مگر ایک روز عجیب واقعہ ہوا..............

اور ہم امام ہوئے!

دارالعلوم نعیمیہ کراچی میں زیر تعلیم تھا کہ ایک بار عیدالفطر سے ایک روز قبل بلکہ شب عید ہی کو دارالعلوم کے بانی و مہتمم پروفیسر ڈاکٹر جسٹس مفتی سید شجاعت علی قادریؒ مدرسہ میں آئے عشاء کی نماز باجماعت ادا کی اور نماز کے بعد مسجد ہی سے میرا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کو چلنے لگے اور بڑی شفقت سے مجھ سے پوچھا آپ عید کہاں پڑھیں گے؟ میں نے کہا یہیں مدرسہ میں پڑھوں گا، فرمایا نہیں آپ صبح میرے ساتھ چلئے گا وہ ان دنوں رحمانیہ مسجد لیاقت آباد میں خطابت کرتے تھے۔ میں یہ سمجھا کہ عیدالفطر کے موقع پر چونکہ بعض طلبہ کو فطرانہ جمع کرنے کیلئے مسجد کے دروازہ پر بٹھایا جاتا ہے، ممکن ہے مجھے اسلئے ساتھ لے جانا چاہتے ہوں، اس لئے میں نے حسب عادت برملا کہہ دیا، حضرت میں فطرانہ جمع کرنے کا کام نہیں کروں گا۔ مفتی صاحب مسکرائے اور فرمایا: نہیں بھئی آپ فطرانہ کیوں جمع کریں گے آپ کو تو صرف نماز عید میں اپنے ساتھ لے جانا ہے آپ فطرانہ کی ڈیوٹی سے مستثنیٰ ہیں جبھی تو ہم لوگوں نے آپ سے کہیں جانے کو نہیں کہا۔ آپ اطمینان رکھئے اور صبح تیار رہئے میں چھ بجے آؤں گا۔

اگلی صبح میں نے تیاری کی اور مفتی صاحب اپنی گاڑی میں چھ بجے تشریف لے آئے مجھے ساتھ بٹھا لیا اور روانہ ہو گئے۔ راستے میں مجھ سے پوچھا ''مولانا عیدالفطر پر کس قسم کی تقریر ہونی چاہئے'' میں نے کہا حضرت آپ بہتر جانتے ہیں فرمایا نہیں آپ سے مشورہ لے رہا ہوں کہ آج کیا مسائل بیان کئے جائیں۔ میں نے کہا یہی عید اور فطرہ وغیرہ کے مسائل پھر انہوں نے خود ہی کہنا شروع کیا میرا خیال ہے کہ اس موقع پر یہ کہنا چاہئے، یوں کہنا چاہئے، یہ بتانا چاہئے اور زیادہ نہیں بس بیس پچیس منٹ کی تقریر کافی ہے پھر نمازِ عید کا طریقہ بیان کرنا چاہئے اور نماز کے بعد دو خطبے۔

یہ باتیں کرتے ہوئے ہم لیاقت آباد نمبر ۱۰ کے چوراہے پر پہنچ گئے اور مفتی صاحب نے گاڑی گھما کر مسجد شہداء کے سامنے جا کھڑی کی، گاڑی سے اترے اور کہا آیئے، ہم حیران کہ حضرت تو خطیب ہیں رحمانیہ مسجد میں اور یہ ہے مسجدِ شہداء ابھی ہم اسی سوچ بچار میں تھے کہ سامنے سے ایک شخص مفتی صاحب کو دیکھ کر لپکا، غالباً یہ اس مسجد کا سیکرٹری تھا مفتی صاحب نے فرمایا لو یہ مولانا آ گئے ہیں ان سے عید کی تقریر کروانا اور اپنے امام سے نماز پڑھوالینا۔ مفتی صاحب کی بات سنتے ہی ہمارے تو پاؤں تلے سے زمین نکل گئی نہ پائے ماندن نہ جائے رفتن، معذرت کرنے کا موقع بھی نہ تھا اور مفتی صاحب ہمیں اس شخص کے حوالے کر کے یہ جا وہ جا، رخصت ہو گئے اس مسجد کے امام ان دنوں مولانا دلاور علی نعیمی صاحب تھے جو علیل تھے، تقریر نہ کر سکتے تھے، وہ تشریف تو لائے مگر انہوں نے سب کچھ ہمیں ہی سونپ دیا اس طرح ہماری باقاعدہ امامت عوام کا آغاز عید کی نماز سے ہوا۔

پھر کبھی کبھی خطبہ جمعہ کے لئے مختلف مساجد میں جانے کا اتفاق رہا۔ امامت کے لئے اللہ تعالیٰ نے میدان عرفات میں جبل رحمت کی چوٹی پر موجود قدیم تاریخی مسجد کے آثار پر غیر متعین امام کے طور پر خدمت کا موقع دیا اور چار برس تک مختلف اوقات میں وہاں نمازوں میں عربوں اور عجمیوں کو نماز پڑھائی۔ مکہ مکرمہ کے محلہ ہنداویہ (جس میں میرا چار برس قیام رہا) کی مسجد بالمقابل مصنع المنیوم میں مستقل امامت فی سبیل اللہ کا موقع ملا۔ حرمین شریفین میں متعدد بار جماعت ثانی کا امام بنایا گیا اور حج و زیارت مدینہ منورہ کے دوران مکہ مکرمہ، مزدلفہ، منیٰ، عرفات، مسجد جعرانہ، مسجد تنعیم، مسجد الجن، مسجد الرایہ، مسجد ذوالحلیفہ، مسجد بدر، مسجد معمورہ میں زائرین مسافرین و مقیمین کی امامت کا موقع نصیب ہوا۔ طائف کی جامع مسجد، مدینہ منورہ کی سبع مساجد، مسجد غمامہ، مسجد قبلتین، مسجد قبا، مسجد احد اور خیبر کے راستے میں واقع اور قلعہ خیبر کے قرب میں موجود مسجد میں بھی زائرین، مسافرین اور مقیمین کی امامت کا شرف حاصل ہوا۔ مصر کی جامع الازہر، قاہرہ کی مسجد حسین، اسکندریہ (مصر) کی مسجد بوصیری، لیبیا طرابلس کی جامع مسجد بنی مالک، عراق کی جامع امام ابو حنیفہ (بغداد)، مسجد درگاہ غوثیہ جامع الشیخ عبدالقادر الگیلانی، کوفہ و بصرہ کرکوک و موصل، سامراء و کاظمین، کربلا و نجف

اشرف، السید احمد الرفاعی الکبیر کی بستی اور دیگر کئی مقامات کی مساجد میں نمازیں ادا کرنے اور کبھی جماعت کرانے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔

علاوہ ازیں ہند و سندھ کی بعض تاریخی مساجد، خصوصاً بمبئی، حیدرآباد دکن اور دہلی کی مشہور مساجد، کولمبو (سری لنکا) کے سفر میں بعض قدیم و جدید مساجد دیکھنے اور وہاں کے آئمہ جماعت سے ملاقات کا موقع ملا۔ سلطنت عمان مسقط میں مدینہ قابوس میں واقع DSA اور السرین (Assarain) کی مساجد میں نماز جمعہ و جماعت پنجگانہ کی امامت کا تین برس موقع ملا۔ میں ان تمام مقامات مذکورہ میں سے کہیں بھی بطور امام متعین ہو کر نہیں گیا بلکہ اپنی ملازمت، یا تحقیقی سفر، یا زیارات یا کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کے لئے گیا مگر اللہ تعالیٰ نے جہاں جہاں میرے مقدر میں امام بننا لکھا تھا وہاں خود ہی لوگوں نے مجھے مصلائے امامت پر بڑھایا میں نے ازخود کہیں امام بننے کی کوشش نہیں کی اور نہ نماز پڑھانے کا معاوضہ لیا۔

ہانگ کانگ کی مرکزی مسجد کولون، کے لئے میرا بطور امام انتخاب ہوا ویزا بھی آ گیا مگر اس میں چونکہ امامت بطور روزگار کا مسئلہ تھا غالباً اسی لئے اللہ تعالیٰ نے مجھ سے انکار کروا دیا اور میں باوجود وہاں کی منتظمہ کے اصرار کے نہ جا سکا۔

الحمدللہ میں نے مسجد کو اب تک ذریعہ روزگار نہیں بنایا اور نہ امامت و خطابت بطور پیشہ ور امام و خطیب کی ہے۔ یہ اللہ کا فضل و احسان ہے کہ روزگار کا وسیلہ میرے لئے اس اللہ رب العزت نے درس و تدریس کو بنا دیا اور دین کی خدمت کا سلسلہ بلا معاوضہ یا کم از کم بغیر تقاضا و مطالبہ کے معمولی خدمت کے ساتھ جاری رہا اور اب بھی ہے۔

اس طرح مجھے ملکی و بین الاقوامی سطح پر آئمہ کرام، مسجد کمیٹیوں، خطباء، واعظین، مدرسین اور اس شعبہ سے تعلق رکھنے والے افراد سے میل جول کا خاصا تجربہ ہوا۔ بہت سی باتیں اس طویل عرصہ کی ذہن میں تھیں۔ کچھ مساجد کمیٹیوں کے حوالہ سے، کچھ ائمہ کرام کے حوالہ سے اور کچھ مقتدیوں کے حوالہ سے۔ میں ان تمام باتوں کا ذکر کرنا چاہتا تھا تا کہ خوبیاں اور خامیاں سب کی بیان کی جائیں اور پھر اصلاحی پہلوؤں پر گفتگو کی جائے مگر میں بھی بعض مصلحتوں کا شکار ہونے سے بچ نہیں سکا۔ کئی باتیں ایسی ہیں جنہیں لکھنے کو دل پھٹ رہا ہے مگر

اس ڈر سے نہیں لکھتا ہوں کہ اصلاح کی بجائے کہیں فساد کا باعث اور تقرب کی بجائے تنفر کا باعث نہ بن جاؤں اور ''اَفَتَّانٌ اَنْتَ'' یا معاذ کا مصداق نہ ٹھہروں۔

مدارس کے بارے میں بے شمار باتیں میرے دماغ میں کلبلا رہی ہیں مگر بعض دوست اور کرم فرما کہتے ہیں کہ ''ہاں میری چشم گناہ گار نے یہ بھی دیکھا'' کا عنوان خلاف مصلحت ہے اسے مت چھیڑو، اس لئے کہ اِثْمُہٗ اَکْبَرُ مِنْ نَفْعِہٖ (اس کا نقصان فائدہ سے زیادہ ہے) اس نصیحت و ہدایت کے بعد میں نے بہت سی باتیں اس کتاب سے حذف کر دی ہیں اور جو کچھ باقی ہے اس سے غرض اصلاح عوام ہے اور بعض ایسے مسائل ائمہ حضرات کے مطالعہ کی خاطر درج کر دیئے ہیں جن کی ائمہ کرام کو ضرورت رہتی ہے۔ آخر میں ایک ضمیمہ مفتی اور منصب مفتی کے عنوان سے شامل کر دیا ہے تاکہ عوام کو مفتیان کرام کی شناخت میں آسانی ہو اور مفتی بننے کے خواہش مند حضرات کے لئے رہنمائی کا کام دے۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ میری اس کوشش کو نفع بخش بنائے اور قوم کو ائمہ کرام و علماء و مشائخ کے احترام کی توفیق بخشے، ائمہ مساجد اور مفتیان کرام کو اپنے منصب کی اہمیت سمجھنے اور اس کے معیار پر پورا اترنے کی ہمت بخشے۔ (آمین)

کتاب کے مطالعہ کے دوران اگر بعض کلمات قارئین مزاج کے مطابق نہ پائیں تو مجھے معذور سمجھیں کہ بیان حق میں کبھی تلخی باوجود کوشش کے نہیں چھپائی جا سکتی۔ اور ''الحق مر و لو کان ذرا.........'' ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ لہٰذا پیشگی معذرت خواہ ہوں۔

ڈاکٹر نور احمد شاہتاز

رویہ

مولوی اونٹ پہ جائے ہمیں منظور مگر
مولوی کار چلائے، ہمیں منظور نہیں

وہ نمازیں تو پڑھائے ہمیں منظور مگر
پارلیمنٹ میں آئے، ہمیں منظور نہیں

حلوہ خیرات کا کھائے تو ہمارا جی خوش
حلوہ خود گھر میں پکائے، ہمیں منظور نہیں

علم و اقبال و رہائش ہو کہ خواہش کوئی
وہ بھی ہم سا نظر آئے، ہمیں منظور نہیں

احترام آپ کا واجب ہے مگر مولانا
حضرتِ والا کی رائے، ہمیں منظور نہیں

از رشحاتِ قلم: جناب سید ضمیر جعفری صاحب

وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا

امام ایک بابرکت نام ہے اور منصب امامت ایک قابلِ احترام ذمہ داری یہ ایک عظیم دینی سیادت ہے امام اور امامت دونوں لفظ اپنے اندر جو وقار اور عظمت رکھتے ہیں ان کی وجہ سے ان الفاظ کے زبان پر آتے ہی امام اولین و آخرین کی طرف ذہن جاتا ہے اور اس مقدس ہستی کا خیال دل میں آنے لگتا ہے جس نے منصب امامت قائم فرمایا۔

اسلام کے ابتدائی دور میں امام مسجد کا اعزاز صرف خلیفہ وقت کو حاصل ہوتا تھا اور وہ جسے چاہتا کسی علاقہ کا امیر و امام مقرر کرتا تھا۔ منصب امامت کی اہمیت سمجھنے کیلئے صرف اتنا کافی ہے کہ اس بات پر غور کرلیا جائے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ظاہری حیات طیبہ میں یہ منصب خود سنبھالا اور جب کبھی آپ سفر پر تشریف لے گئے تو مدینہ طیبہ (مسجد نبوی) میں کسی بزرگ و لائق ترین شخص کو اپنا قائم مقام مقرر فرمایا اور دورانِ سفر خود امامتِ نماز کا فریضہ انجام دیا اگر یہ ثانوی حیثیت کا حامل منصب ہوتا تو آپ صحابہ کرامؓ میں سے کسی کو بھی اپنی موجودگی میں اس منصب پر فائز فرماتے جیسا کہ اور بہت سے امور صحابہ کے سپرد تھے مگر آپ نے اس کی اہمیت کے پیش نظر یہ خدمت تاحیات خود انجام دی اور وصال سے قبل یہ ذمہ داری صحابہ کرام میں سے سب سے افضل شخص کے سپرد فرمائی۔

خلفائے راشدین اپنے اپنے دورِ خلافت میں منصب امامت پر فائز رہے اور بنو

امیہ و بنو عباس کے دور میں بھی خلیفہ اگر نماز پنجگانہ کی جماعت کی امامت نہ کرا سکتا تو کم از کم نماز جمعہ و عیدین کی امامت و خطبہ اسی کا حق و فرض تھا۔اور یہ سلسلہ ہندوستان کے مغلیہ خاندان تک عالم اسلام میں اسی طرح جاری و ساری رہا اکثر مسلمان امراء و سلاطین اسی پر کاربند تھے۔ برصغیر میں انگریزوں کی آمد کے بعد سے یہ سلسلہ بتدریج ختم ہوگیا اور انگریزوں نے اس دینی منصب کے وقار کو ختم کرنے کے لئے علماء کرام کو دنیاوی مناصب سے الگ کیا اور یوں دینی و دنیوی منصب دو الگ الگ حیثیتوں سے پہچانے جانے لگے۔ پھر انگریزی سامراج نے علماء و ائمہ کی اہانت کا سلسلہ شروع کیا اور انہیں تنخواہ دار ملازموں اور پھر نچلے درجے کے لوگوں میں شامل کر دیا۔ ایک وقت ہندوستان میں ایسا بھی آیا جب امام مسجد کو گاؤں کے نائی، موچی، ترکھان، جولاہا اور لوہار کی طرح ایک ''کمی'' شمار کیا جانے لگا اور اس کا نام بھی ایسے پیشوں سے تعلق رکھنے والوں کی صف میں شامل کر دیا گیا۔ ہندوستان و پاکستان کے بعض دیہات میں یہ سلسلہ اب بھی اسی طرح قائم ہے۔

امام اور امامت کے منصب کی عظمت و فضیلت نبی اکرم ﷺ کے ارشادات میں مذکور ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس سلسلہ کی بعض احادیث پیش کی جائیں اور پھر امامت سے متعلق فقہی احکامات اور دیگر مسائل و معاملات پر بات کی جائے۔

منصب امامت اور امام کی فضیلت:

منصب امامت اسلامی مناصب میں سے اہم ترین منصب ہے نبی اکرم ﷺ سے اس منصب کی فضیلت میں متعدد اقوال منقول ہیں۔ امام اللہ اور بندوں کے مابین ایک رابطے کا ذریعہ ہے وہ لوگوں کے وکیل کی حیثیت سے بارگاہ الٰہی میں مناجات کرتا ہے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

اِجْعَلُوْا اَئِمَّتِکُمْ خِیَارَکُمْ فَاِنَّهُمْ وَفْدُکُمْ فِیْمَا بَیْنَکُمْ وَ بَیْنَ رَبِّکُمْ

(کنز العمال، ج ۷، حدیث ۲۰۴۳۲)

یعنی تم میں جو اچھے اور بہتر ہوں ان کو اپنا امام بناؤ کیونکہ تمہارے رب اور مالک کے حضور وہ تمہارے نمائندے ہوتے ہیں ایک اور حدیث میں ہے۔

اَلاِمَامُ اَمِیرٌ فَاِذَا رَکَعَ فَارْکَعُوْا وَ اِذَا سَجَدَ فَاسْجُدُوْا۔

یعنی امام تمہارا امیر ہے جب وہ رکوع کرے تم رکوع کرو اور جب وہ سجدہ کرے تو تم سجدہ کرو۔

یہ روایت سنن ابی داؤد اور ترمذی میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص ایک مسجد میں سات برس امامت کرے اس کے لئے جنت واجب ہے اور جو شخص چالیس برس اذان دے وہ جنت میں بے حساب داخل کیا جائے گا یہ حدیث جامع الترمذی میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے۔

دار قطنی اور بیہقی میں ایک روایت اس طرح ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تمہارے امام تمہارے شفیع ہوں گے یا یوں فرمایا کہ یہ تمہاری طرف سے اللہ تعالیٰ کے پاس جانے والے ہیں پس اگر تم اپنی نماز کو صاف کرنا چاہتے ہو تو جو تم میں سے بہتر ہو اس کو آگے کیا کرو۔

دیلمی میں ایک روایت حضرت ابو ہریرہؓ سے یوں منقول ہے کہ:

''خَیْرُ بُقْعَةٍ فِی الْمَسْجِدِ خَلْفَ الاِمَامِ . وَ اِنَّ الرَّحْمَةَ اِذَا نَزَلَتْ بَدَاَتْ بِالاِمَامِ ثُمَّ الَّذِیْ خَلْفَهٗ ثُمَّ یُمْنَهٗ ثُمَّ یُسْرَهٗ ثُمَّ تَتَغَاصَ الْمَسْجِدَ بِاَهْلِهٖ

(کنز العمال، ج ۷، حدیث ۲۰۵۱۹)

یعنی مسجد میں سب سے اچھی جگہ وہ ہے جو امام کے پیچھے ہے اور اللہ کی رحمت جب نازل ہوتی ہے تو اس کی ابتداء امام سے ہوتی ہے پھر وہ رحمت اس شخص پر نازل ہوتی ہے جو امام کے پیچھے ہو پھر اس پر جو اس کے دائیں جانب ہو پھر اس پر جو اس کے بائیں جانب ہو۔ پھر پوری مسجد والوں میں پھیل جاتی ہے۔

صحیح مسلم کی روایت میں امام کو ڈھال کہا گیا ہے فرمایا اِنَّمَا الاِمَامُ جُنَّةٌ ایک اور حدیث میں امام کو مقتدیوں کی نمازوں کا ضامن کہا گیا ہے۔ ارشاد امام الانبیاءؐ ہے اَلاَئِمَّةُ ضُمَنَاءُ'' یعنی امام ضامن ہوتے ہیں۔ (کنز العمال، ج ۷، حدیث ۲۰۴۰۷)

یہ حدیث الفاظ کے ذرا سے فرق کے ساتھ طبرانی، مسند احمد بن حنبل، صحیح ابن حبان اور مصنف عبد الرزاق میں بھی موجود ہے۔ کنز العمال میں ایک روایت فضیلت امام کے

سلسلہ میں اس طرح مذکور ہے۔

اَفۡضَلُ النَّاسِ فِی الۡمَسۡجِدِ الاِمَامِ ثُمَّ الۡمُؤَذِّنِ ثُمَّ مَنۡ عَلٰی یَمِیۡنِ الاِمَامَ۔ (کنز العمال، ج ۷، حدیث ۲۰۳۷۵)

یعنی مسجد میں موجود لوگوں میں افضل ترین شخص امام ہے پھر موذن، پھر وہ جو امام کے دائیں جانب والے لوگ ہوں۔ یہ حدیث دیلمی کی مسند الفردوس میں حضرت علیؓ سے مروی ہے۔

فضیلت امام کی ایک اور حدیث جس کے راوی حضرت ابو ہریرہؓ ہیں اس طرح ہے۔

"لِلاِمَامِ وَالۡمُؤَذِّنِ مِثۡلَ اُجُوۡرَ مَنۡ صَلّٰی مَعَهُمَا"

یعنی امام اور موذن کو اتنے لوگوں کی نمازوں کے برابر نماز کا ثواب ملتا ہے جتنے لوگ ان کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔ (کنز العمال، ج ۷، حدیث ۲۰۳۷۴)

مذکورہ بالا احادیث کے مطالعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ منصب امام کس قدر باعث خیر و برکت اور حامل فضیلت ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ احیاء العلوم میں فرماتے ہیں:

"بعض سلف کا قول ہے کہ انبیاء کے بعد علماء سے افضل کوئی نہیں اور علماء کے بعد نماز پڑھانے والے امام سے زیادہ افضل کوئی نہیں، کیونکہ یہ تینوں فریق اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق میں رابطہ کا ذریعہ ہیں۔ انبیاء تو اپنی نبوت کے باعث، علماء علم کی وجہ سے اور امام، دین کے اہم رکن نماز کے سبب"

(احیاء العلوم، ج ۱، ص ۲۸۰)

شرائط امامت

جس شخص میں مندرجہ ذیل شرائط پائی جائیں اسے امام (نماز) بنایا جاسکتا ہے۔

- مسلمان ہو، ● بالغ ہو، ● عاقل ہو، ● مرد ہو، ● تلاوت کرسکتا ہو،
- عذر سے سلامت ہو۔

یہ وہ شرائط ہیں جو فقہ حنفی کی تمام معتبر کتابوں میں مذکور ہیں۔ (حوالہ کے لئے دیکھئے درمختار وغیرہ) (۱)

اب ان شرائط کی وہ تشریح پیش کی جاتی ہے جو فقہاء حنفیہ کی بیان کردہ ہیں۔

◆ پہلی شرط یہ ہے کہ مسلمان ہو۔ کیونکہ ایسے شخص کی امامت صحیح نہیں جو منکر رسالت ہو یا سیدنا صدیق اکبرؓ کی خلافت کا منکر ہو، یا ان کی صحابیت کا منکر ہو، یا شیخین کو گالی دیتا ہو، یا شفاعت کا منکر ہو۔

◆ امام کے لئے دوسری شرط بلوغ یا بالغ ہونا ہے۔ چنانچہ کسی ایسے بچے کو امام بنانا صحیح نہیں جو اگرچہ باشعور ہو مگر نابالغ ہو۔

◆ تیسری شرط "عاقل ہونا" ہے جس کے معنی ہیں کہ کوئی ایسا شخص امام نہ بنایا جائے جو فاتر العقل ہو، لیکن اگر کوئی شخص ایسا ہے کہ اس پر کسی وقت جنون (پاگل پن) کا غلبہ ہوتا ہے اور کبھی وہ صحیح ہوتا ہے تو جس وقت وہ صحیح ہو اس وقت اس کی امامت جائز ہوگی۔

- چوتھی شرط ''مرد ہونا'' ہے یعنی عورت امام نماز نہیں ہو سکتی اور نہ ہی ہیجڑا امام بن سکتا ہے۔ بچوں کا معاملہ پہلے ہی بیان ہو چکا کہ وہ بھی امام نہیں بن سکتے۔
- پانچویں شرط ''تلاوت کر سکتا ہو'' یعنی اسے اتنی آیات یاد ہوں کہ جن کی تلاوت سے نماز صحیح طور پر ادا ہو جاتی ہو۔ اس میں اختلاف ہے کہ کم از کم کتنی آیات یاد ہونی ضروری ہیں تاہم ایک قول کے مطابق کم از کم تین آیتیں جسے یاد ہوں وہ امام بن سکتا ہے۔
- چھٹی شرط ''عذر سے سلامتی'' ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ امام کسی ایسے مرض میں مبتلا نہ ہو جس سے اسے معذوروں میں شمار کیا جائے۔ جیسے پیشاب کے قطروں کی بیماری، دائمی پیچش، یا بواسیر بادی وخونی کہ جس میں ہوا یا خون رستا ہی رہتا ہو، یا نکسیر کا جاری رہنا وغیرہ۔ چنانچہ اس قسم کے امراض کے شکار شخص کی امامت صحیح نہیں۔ (۲)

امام میں بعض اضافی خوبیاں:

امام یا امامت کے لئے ان چھ شرائط کے علاوہ بعض دیگر خوبیوں کا ہونا اضافی بات ہے گویا اگر ان چھ بنیادی شرائط میں سے کوئی شرط کم ہوگی تو ایسے شخص کو امام نہیں بنایا جائے گا لیکن اضافی خوبیوں میں سے اگر بہت سی خوبیاں بھی نہ ہوں تو وہ جب بھی امام بنائے جانے کے لائق ہے۔ ان اضافی خوبیوں کی کوئی تعداد مقرر نہیں اور ہر دور کے علماء نے اپنے اپنے زمانہ کے تقاضا کے مطابق بہت سی خوبیاں بیان کی ہیں۔ مثلاً حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی حنبلی رحمہ اللہ علیہ کے حوالہ سے غنیۃ الطالبین میں امام کے اوصاف اس طرح بیان کئے گئے ہیں۔

۱۔ اس شخص کو (جسے امام بنایا گیا ہے) خود امامت کی خواہش نہ ہو، لیکن اس صورت میں کہ دوسرا آدمی اس منصب کو انجام دینے والا موجود ہو (اگر موجود نہ ہو تو خواہش کرنا درست ہے)۔

۲۔ جب اس سے افضل شخص امامت کے لئے موجود نہ ہو تو بھی خود آگے نہ بڑھے۔

۳۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ''لوگوں کی امامت کوئی

(معمولی) شخص کرے اور اس سے افضل شخص اس کے پیچھے موجود ہو تو ایسے لوگ ہمیشہ پستی میں رہیں گے۔" حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ اگر میری گردن ماردی جائے تو میری نظر میں یہ اس بات سے بہتر ہے کہ میں ایسی جماعت کی امامت کروں جس میں ابو بکر صدیقؓ موجود ہوں۔

۴۔ امام قاری ہو دین کی باتیں سمجھتا ہو، سنت سے خوب آگاہ ہو، حدیث شریف میں آیا ہے کہ "اپنا دینی معاملہ تم اپنے فقیہوں کے سپرد کردو اور قاریوں کو اپنا امام بناؤ۔" ایک دوسری حدیث اس سلسلہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہاری امامت وہ لوگ کریں جو تم میں بہتر ہوں وہ اللہ کی بارگاہ میں تمہارے نمائندے ہیں۔ حضور ﷺ نے یہ تخصیص اس لئے فرمائی ہے کہ دین دار امام اور علم و فضل رکھنے والے لوگ، اللہ کو جاننے اور اس سے ڈرنے والے ہوتے ہیں وہ اپنی نماز اور اپنے مقتدیوں کی نماز کو سمجھتے ہیں اور وہ نماز کو خراب کرنے والی باتوں سے گریز کرتے ہیں وہ خود اپنا اور اپنے مقتدیوں کا بار اٹھاتے ہیں۔ قاری قرآن سے حضور ﷺ کی مراد بے عمل قاری نہیں بلکہ باعمل حافظ ہے۔ حدیث شریف میں وارد ہے کہ اس قرآن کا زیادہ حقدار وہ ہے جو اس پر عمل کرتا ہے اگرچہ وہ اس کو پڑھتا نہ ہو یعنی حافظ و قاری نہ ہو۔ جو قاری قرآن پر عمل نہیں کرتا اور حدود الٰہی کی پرواہ نہیں کرتا نہ اللہ تعالیٰ کے فرائض پر عمل کرتا ہے اور نہ اس کی ممنوعات سے بچتا ہے اللہ بھی اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتا اور نہ ایسا شخص عزت و کرامت کا مستحق ہے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ جس نے قرآن کی حرام کردہ چیزوں کو حلال جانا وہ قرآن پر ایمان نہیں رکھتا لوگوں کو جائز نہیں کہ ایسے شخص کو امام بنائیں۔ امامت کے لائق وہی ہے جو سب سے زیادہ عالم ہونے کے ساتھ اس پر عمل بھی کرے اور اس کو خدا کا خوف ہو۔

۵۔ امام لوگوں کی عیب جوئی اور غیبت سے اپنی زبان کو روکے۔ دوسروں کو نیکی کا حکم دے اور خود بھی اس پر عمل کرے، دوسروں کو برائی سے منع کرے اور خود بھی باز رہے۔ نیکی

اور نیک لوگوں سے محبت رکھے، بدی سے نفرت کرے، اوقات نماز سے واقف ہو اور ان کی پابندی کرے، اپنے حال کی اصلاح کرتا رہے، مشتبہ روزی سے بچتا ہو (پاکیزہ شکم ہو) حرام باتوں سے اجتناب کرتا ہو، فعل حرام سے اپنے ہاتھوں کو روکنے والا ہو۔ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے سوا دوسری چیزوں کی کم کوشش کرے۔ دنیا کی طلب اس میں نہ ہو، حلیم ہو، صابر ہو اور شر سے چشم پوشی و اعراض کرنے والا ہو۔ لوگ اگر اس پر نکتہ چینی کریں تو صبر کرے اور خدا کا شکر ادا کرے، برے کاموں سے آنکھوں کو بند رکھے۔ ہر کام حلم اور بردباری سے انجام دے۔ ستر عورت سے اپنی آنکھوں کو بچائے۔ اگر کوئی جاہل اس کے ساتھ برائی سے پیش آئے تو اس کی برائی کو برداشت کرے اور کہہ دے اَللّٰھُمَّ سلامًا لوگ اس کی طرف سے آرام پائیں (لوگوں کو اس سے تکلیف نہ پہنچتی ہو) لیکن وہ خود اپنے نفس کی طرف سے بے چین ہو، نفسانی خواہشات سے اپنی آزادی کا خواہاں ہو اور ان سے اپنے نفس کی رہائی کی کوشش کرتا ہو وہ ہمیشہ اس بات کو محسوس کرتا ہو کہ امامت جیسے عظیم کام کو اس کے سپرد کرکے اس کی آزمائی کی گئی ہے، امامت کا درجہ بہت بزرگ اور عظیم ہے۔ امام کے پیش نظر ہمیشہ امامت کی عظمت ومرتبت رہنا چاہئے۔

امام کو لازم ہے کہ بیکار گفتگو نہ کرے۔ امام کی حالت دوسرے لوگوں کی حالت سے بالکل جداگانہ ہے۔ جب وہ محراب میں کھڑا ہو تو اس وقت اس کو سمجھنا چاہئے کہ میں انبیاء اور رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ کے مقام پر کھڑا ہوں اور رب العالمین سے کلام کر رہا ہوں۔ نماز کے ارکان پورے پورے ادا کرنے کی دل سے کوشش کرے اور جن لوگوں نے امامت کی یہ رسی اس کے گلے میں ڈالی ہے یعنی اس کو امام بنایا ہے ان کی نماز کی تکمیل کی بھی کوشش کرے۔ نماز مختصر پڑھے اس غرض سے کہ تمام ارکان پورے ادا ہو جائیں۔ جو لوگ اس کے پیچھے کھڑے ہیں ان کا خیال کرے کہ ان میں کمزور اور ضعیف لوگ بھی شامل ہیں اس لئے اپنے آپ کو کمزور و ناتواں لوگوں میں شمار کرے۔

اللہ تعالیٰ امام سے خود اس کے بارے میں اور دوسرے لوگوں (مقتدیوں) کے

متعلق باز پرس فرمائے گا۔ اپنی اس امامت کی ذمہ داری پر تاسف کرے، سابقہ خطاؤں، گناہوں اور تلف کردہ اوقات پر ندامت کا اظہار کرے۔ اپنے آپ کو مقتدیوں سے برتر نہ سمجھے اور اسی طرح کم درجہ لوگوں سے اپنے کو برتر نہ گردانے، مگر کوئی شخص اس کی برائی کرے تو اسے برا نہ سمجھے۔ اگر اس کی غلطی ظاہر کرے تو نفسانی خواہش کے پیش نظر ہٹ دھرمی اور ضد نہ کرے۔ اس بات کو پسند نہ کرے کہ لوگ اس کی تعریف کریں۔ تعریف اور مذمت دونوں کو برابر سمجھے۔ امام کا لباس صاف ستھرا اور خوراک پاک ہو اس کے لباس سے تکبر اور بڑائی ظاہر نہ ہوتی ہو، اس کی نشست میں غرور کی جھلک نہ ہو، کسی جرم کی سزا میں اس پر اسلامی حد جاری نہ کی گئی ہو (سزا یافتہ نہ ہو)۔ لوگوں کی نظر میں متہم نہ ہو۔ کسی بھائی کی حاکموں سے لگائی بجھائی نہ کرتا ہو، لوگوں کے رازوں کا تحفظ کرے۔ (پردہ دری نہ کرے) کسی بھائی سے کینہ نہ رکھے۔ امانت، تجارت اور مستعار چیزوں میں اس نے خیانت نہ کی ہو۔ خبیث کمائی والا امامت کا اہل نہیں ہے، جس کے دل میں حسد، کینہ اور بغض ہو اس کو بھی امام نہ بنایا جائے، وہ کسی کے عیب کی تلاش میں نہ ہو اور امت محمدیہ کو فریب دینے والا، مغلوب الغضب، نفس پرست اور فتنہ پرور شخص کو بھی امام نہیں بنانا چاہئے۔

امام کے لئے ضروری ہے کہ فتنہ پیدا کرنے کی کوشش نہ کرے نہ فتنہ کو تقویت پہنچائے بلکہ باطل پرستوں کے خلاف اہل حق کی مدد کرے ہاتھ سے ممکن نہ ہو تو زبان سے، اگر زبان سے بھی ممکن نہ ہو تو دل سے ان کی مدد کا خواہاں ہو۔ اللہ کے معاملہ میں کسی برا کہنے والے کے برا کہنے کا خیال نہ کرے۔ اپنی تعریف کو پسند نہ کرے نہ اپنی مذمت کا برا مانے، اپنے لئے دعا میں تخصیص نہ کرے بلکہ جب دعا کرے تو اپنے لئے اور تمام لوگوں کے لئے عام طور پر دعا کرے۔ اگر تنہا اپنے لئے دعا کرے گا تو دوسروں کے ساتھ خیانت ہوگی۔

اہل علم کے سوا کسی کو کسی پر ترجیح نہ دے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے مجھ سے متصل دانشور اور ذی فہم لوگ کھڑے ہوں اسی طرح امام کے پیچھے یعنی اگلی صف میں ایسے ہی لوگوں کو ہونا چاہئے۔ دولت مند کو اپنے قریب اور غریب کو حقیر جان کر دور کھڑا نہ کرے۔ ایسے لوگوں کی امامت نہ کرے جو اس کی امامت کو پسند نہیں کرتے۔ اگر مقتدیوں میں کچھ

لوگ اس کی امامت کو پسند اور کچھ ناپسند کرتے ہیں تو ناپسند کرنے والوں کی تعداد اگر زیادہ ہے تو امام کو محراب چھوڑ دینا چاہیے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ مقتدیوں کی ناگواری اور ناپسندیدگی کی وجہ حقانیت اور علم و آگہی پر مبنی ہو اگر ناگواری کا باعث جہالت، باطل پرستی، نادانی اور فرقہ وارانہ تعصب، نفسانی خواہش پر مبنی ہو تو پھر مقتدیوں کی ناگواری کی پروانہ کرے اور ان کی وجہ سے نماز پڑھانا ترک نہ کرے اگر قوم میں اس بناء پر فتنہ و فساد برپا ہونے کا اندیشہ ہو تو البتہ کنارہ کش ہو جائے اور محراب کو چھوڑ دے اور اس وقت تک محراب کے پاس نہ جائے جب تک لوگ آپس میں صلح نہ کرلیں اور اس کی امامت پر راضی نہ ہو جائیں۔ امام جھگڑنے والا، زیادہ قسمیں کھانے والا اور لعنت کرنے والا نہ ہو، اس کو برائی کی جگہ اور تہمت کے مقام پر جانا مناسب نہیں اس کو چاہئے کہ صالحین کے علاوہ کسی سے میل ملاپ نہ رکھے۔ امام کو لازم ہے کہ فتنے اور فساد اٹھانے والوں سے گناہ اور گناہگاروں سے سرداری اور سرداروں سے محبت نہ کرے، اگر لوگ اسے ایذا پہنچائیں تو اس پر صبر کرے اور اس کے عوض ان سے محبت کرے اور ان کی بھلائی کا طالب ہو اور خیر خواہی کی کوشش کرتا رہے۔

امامت کے لئے جھگڑا نہیں کرنا چاہئے اور اگر کوئی دوسرا شخص اس بار کو اس کی جگہ اٹھانا چاہتا ہے تو اس سے اس معاملے میں نہ جھگڑے، اکابرین ملت اور صالحین سلف کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے امام بننے سے گریز کیا ہے اور خود امام بننے کی بجائے انہوں نے امامت کے لئے ایسے لوگوں کو آگے بڑھا دیا جو بزرگی اور تقویٰ میں ان کے برابر نہیں تھے، اس طرز عمل سے ان کا مدعا یہ تھا کہ خود ان کا بوجھ ہلکا ہو جائے وہ اس بات سے ڈرتے تھے کہ کہیں امامت میں ان سے کوئی قصور و کوتاہی نہ ہو جائے۔ اگر حاضرین میں حاکم وقت موجود ہو تو اس کی اجازت کے بغیر امامت کے لئے آگے نہ بڑھے اسی طرح جب کسی گاؤں میں یا قبیلہ میں پہنچے تو وہاں کے لوگوں کی اجازت کے بغیر امامت نہ کرے، اسی طرح کسی قافلہ یا سفر میں بہت سے لوگوں کے ساتھ ہو جانے کا اتفاق ہو تو ساتھیوں کی اجازت کے بغیر ان کی امامت نہ کرے، نماز لمبی نہیں پڑھانا چاہئے بلکہ مختصر پڑھانا چاہئے۔ مگر ارکان پورے ادا کرے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور نے ارشاد فرمایا کہ:

''جب تم میں سے کوئی امام ہو تو نماز کو مختصر کرے کیونکہ اس کے پیچھے بچے بوڑھے اور کام کرنے والے لوگ بھی کھڑے ہوتے ہیں ہاں اگر نماز تنہا پڑھے تو پھر جتنی چاہے لمبی پڑھے۔''

حضرت ابو واقدؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو لوگوں کو نماز پڑھاتے تو بہت ہی مختصر نماز ہوتی اور جب بہ نفس نفیس ادا فرماتے تو سب سے زیادہ لمبی نماز ہوتی۔ (غنیۃ الطالبین) (۳)

ہم نے شرائط امامت اور پھر امام کی اضافی صفات کا ذکر وضاحت سے کر دیا ہے

اب اگر کسی کو فقہاء کی بیان کردہ شرائط کے مطابق امام مل جائے تو فقہی نماز کے لئے وہ کافی اور اگر کسی کو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی بیان کردہ صفات کا حامل امام مل جائے تو سبحان اللہ مگر فی زمانہ شاید ایسا ہونا انتہائی دشوار ہے۔ اور ایسے امام کی تلاش میں ترک جماعت ہرگز پسندیدہ نہیں ہے۔

ترجیح کسے دی جائے؟

فقہ کی تقریباً سبھی کتابوں میں یہ مسئلہ مذکور ہے کہ امامت کا زیادہ حق دار کون ہے اور اس سلسلہ میں بعض ترجیحات بیان کی گئی ہیں یعنی اگر کہیں امام کا تقرر کرنا مقصود ہو اور بہت سی خوبیوں کے مالک لوگ منصب امامت کے لئے دستیاب ہوں تو ان میں سے ترجیح کسے دی جائے۔ فتاویٰ عالمگیری میں اس مسئلہ پر اس طرح گفتگو کی گئی ہے:

''امامت کے لئے سب سے زیادہ اولیٰ (یعنی افضل ترین) وہ شخص ہے جو نماز کے احکام زیادہ جانتا ہو، اور یہ ترجیح اس صورت میں ہے کہ وہ نماز کے احکام زیادہ جاننے کے ساتھ ساتھ اتنی تلاوت (قرأت) بھی کر سکتا ہو جس سے نماز ادا ہو جائے۔ پھر اسکے دین میں بھی کچھ طعن نہ ہو (یعنی اس کی دینداری مسلم ہو) اور وہ ظاہری گناہوں سے بچتا ہو تو وہی (زیادہ) مستحق ہے۔ اگرچہ اس

کے سوا کوئی اور شخص زیادہ پرہیز گار ہو۔ لیکن اگر کوئی شخص نماز کے احکامات تو مکمل طور پر جانتا ہو مگر اس کے علاوہ دیگر علوم نہ جانتا ہو تو بھی وہ اولیٰ ہے پھر اگر دو شخص ایسے ہوں کہ دونوں نماز کے احکام برابر جانتے ہیں تو پھر ان میں سے جو علم قرآن زیادہ جانتا ہو وہ اولیٰ ہے۔ پھر اگر اس لحاظ سے بھی وہ برابر ہوں تو ان میں سے جو زیادہ عمر کا ہے وہ اولیٰ ہے پھر اگر باقی معاملات کے علاوہ عمر میں بھی وہ مساوی ہوں تو پھر ان میں جو زیادہ پر نور چہرے والا ہو وہ افضل ہے۔ پھر اگر اس لحاظ سے بھی برابر ہوں تو ان میں جو خاندانی اعتبار سے زیادہ شریف ہے۔ (اچھی ذات و خاندان والا ہے) وہ افضل ہے۔ اور اگر (بالفرض) ایسا ہو کہ دو شخص امامت کیلئے ایسے موجود ہوں جن میں یہ تمام صفات برابر ہوں تو پھر ان میں قرعہ اندازی کی جائے (جس کے حق میں قرعہ نکلے اسے امام مقرر کیا جائے) یا نمازیوں کے اختیار پر چھوڑ دیا جائے وہ جسے امام بنالیں اس کو امام بنایا جائے۔ (۴)

قاری افضل ہے یا عالم؟

ہمارے ہاں مساجد میں امام کا تقرر کرتے وقت عموماً یہ دیکھا جاتا ہے کہ امامت کے لئے ایسا شخص ملے جو خوش الحان ہو۔ جس کی آواز مترنم ہو، یا جو خوب طرز اور لے کے ساتھ قرآن پڑھتا ہو (اگرچہ قواعد قرأت و تجوید کے خلاف ہی پڑھ رہا ہو) علم اور نماز کے مسائل سے کما حقہ، واقفیت یا دیگر علوم میں مہارت اول تو کوئی پوچھتا نہیں اور اگر پوچھیں بھی تو اس کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔ بہت سی مساجد میں تقرر صرف سند پر ہو جاتا ہے اگرچہ سند والا خود اپنی سند کی عربی عبارت کا ترجمہ بھی نہ کر سکتا ہو۔ فقہ کی تمام کتابوں میں یہ مسئلہ مذکور ہے کہ امام اس شخص کو بنایا جائے جو مکمل عالم ہو یا کم از کم نماز کے مسائل کا عالم ہو۔ پھر اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ عالم اور قاری میں سے ترجیح کس کو دی جائے گی۔ حنفی مسلک کے مطابق ترجیح ''عالم'' کو ہے ''قاری'' کو نہیں، یہی مسلک امام اعظم ابو حنیفہؒ کے علاوہ امام شافعی اور امام مالک کا بھی ہے۔ ہدایہ میں ہے

و اولی الناس بالامامة اعلمهم بالسّنة

یعنی جو شخص جماعت والوں میں سے سنت کا زیادہ عالم ہو وہ امامت کے لئے اولیٰ ہے۔ (۵)

عین الہدایہ میں اس کی تشریح میں لکھا ہے کہ سنت سے مراد فقہ و احکام شرعیہ ہیں۔ (۶)

اس سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ کا عمل ہمارے لئے اصل نمونہ و مشعل راہ ہے کہ آپ نے ایام مرض میں اپنے قائم مقام امامت کیلئے جس شخص کا انتخاب کیا وہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ تھے جو دیگر تمام صحابہ میں علم و فضل کے لحاظ سے ممتاز تھے۔ اگر عرفی قاری کو عالم پر امامت کے سلسلہ میں ترجیح حاصل ہوتی تو نبی اکرم ﷺ حضرت ابی ابن کعب ؓ کو امام مقرر فرماتے جو صحابہ میں سب سے اچھے قاری تھے اور جن کے بارے میں خود آپ کا ارشاد ہے کہ صحابہ میں سب سے زیادہ اچھی قرأت کرنے والے حضرت ابی ہیں۔ (واقراء هم ابی)

عالم کی اقتداء میں نماز کی فضیلت:

طبرانی میں ایک مرفوع حدیث اس سلسلہ میں اس طرح مذکور ہے۔

اِنْ سَرَّکُمْ اَنْ تُقْبَلَ صَلاتَکُمْ فلیؤمکم عُلماؤکُمْ فَاِنَّھُمْ وَفدکُمْ مَا بَیْنَکُمْ وَ بَیْنَ رَبِّکُمْ (۷)

یعنی اگر تمہیں یہ بات بھلی لگتی ہے کہ تمہاری نمازیں قبول ہوں تو تمہارے علماء تمہارے امام ہوں۔ کیونکہ وہ تمہارے اور تمہارے رب کے درمیان تمہارے نمائندے ہیں۔ (کنز العمال، ج ۷/۲۰۴۳۴)

مذکورہ بالا آثار واقوال سے یہ بات واضح ہوئی کہ عالم امام قاری سے افضل ہے اور عالم کی اقتداء میں نماز ادا کرنے کا ثواب زیادہ ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عالم کی نماز میں احتیاط کا پہلو غالب ہے اور وہ جانتا ہے کہ دوران نماز کس قسم کی غلطی کا ازالہ کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ قاری جو صرف قاری یا خوش الحان ہو عالم نہ ہو وہ قرأت تو خوبصورتی سے کرلے گا مگر پوری نماز خوب صورتی سے نہیں پڑھا سکتا کہ وہ مسائل سے آگاہ و واقف نہیں۔

ہاں اگر کوئی ایسا امام میسر آئے جو عالم ہونے کے ساتھ ساتھ قاری بھی ہو تو یہی افضل ترین ہے قرأت بھی ایک علم ہے اور عالم کی تعریف یہ ہے کہ جو زیادہ علم رکھتا ہو، سیدنا صدیق اکبرؓ ایسے ہی عالم تھے کہ جو علم قرأت بھی رکھتے تھے۔

امام کا لباس کیسا ہو؟

یہ ایک اہم سوال ہے؟ اور اس دور میں تو اس کی اہمیت اور بھی ہے۔ اس لئے کہ بعض جاہل قسم کے لوگوں نے یہ بات مشہور کر رکھی ہے کہ امام کا ایک مخصوص لباس ہونا چاہئے اور بعض مساجد میں اس بات کا التزام اور پابندی کی جاتی ہے کہ امام وہ مخصوص لباس پہن کر ہی نماز پڑھائے اور اگر کوئی امام وہ مخصوص لباس پہننے کی پابندی قبول نہ کرے تو اسے لائق امامت نہ سمجھتے ہوئے منصب امامت سے معزول اور فارغ کر دیا جاتا ہے۔

امام کے لئے بھی اسی قدر لباس نماز کیلئے کافی ہے جس قدر مقتدی کے لئے اور نماز صحیح ہونے کیلئے جو لباس شرع نے ضروری قرار دیا ہے وہ اسی قدر ہے جس سے ستر عورت ہو جائے یعنی ننگ چھپ جائے اور مرد کا ستر ناف سے گھٹنوں تک ہے جبکہ عورت کا پورا بدن۔

ہاں البتہ لباس مسنون پہننا اور پورے بدن کو ڈھانپنا یہ فضیلت ہے اور پورے لباس کے ہوتے ہوئے جان بوجھ کر بقدر ستر پہننا صحیح نہیں۔ اگرچہ نماز ہو جائے گی۔ علامہ کاسانی فرماتے ہیں:

اَلْمُسْتَحَبُّ اَنْ يُّصَلِّيَ الرَّجُلَ فِيْ ثَلَاثَةِ اَثْوَابٍ، قَمِيْصٍ وَ اِزَارٍ وَ عَمَامَةٍ (۱)

یعنی مستحب یہ ہے کہ مرد تین کپڑوں میں نماز پڑھے قمیص، تہبند اور عمامہ۔

کاسانی کے الفاظ قابل غور ہیں۔ ''المستحب'' یعنی مستحب یہ ہے کہ تین کپڑے ہوں، فرض اور واجب نہیں کہا، ہمارے اس دور میں امام سے جس طرح کا لباس پہننے کا تقاضا کیا جاتا ہے اس کا پہننا فرض واجب نہیں زیادہ سے زیادہ مستحب ہے اور تارک مستحب گناہ گار نہیں ہوتا، نہ امامت کیلئے نااہل قرار دیا جا سکتا ہے۔ سنن بیہقی کی ایک روایت اس طرح ہے:

عَنْ عَبْدُ اللهِ بن عمر عَن رَّسُوْلِ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا صَلّٰی اَحَدَکُمْ فَلْیَلْبِسْ ثَوْبَیَةِ فَاِنَّ عَزَّوَجَلَّ اَحَق اَنْ یزین لهٗ۔

یعنی حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ ''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھے تو (کم از کم) دو کپڑوں میں نماز پڑھے کیونکہ اللہ تعالیٰ اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اس کیلئے زینت اختیار کی جائے۔'' (۹)

اس حدیث مبارکہ سے لباس زینت پہننے کا استحباب ثابت ہوتا ہے، نہ کہ فرضیت۔ دوسری بات یہ کہ دو کپڑوں میں نماز پڑھنے کا حکم اس لئے ہے کہ عام حالات میں کوئی صرف ایک کپڑے میں جیسے صرف قمیص بغیر تہبند کے یا صرف تہبند بغیر قمیص کے پہن کر نہ پڑھے۔ اگرچہ بوقت مجبوری یہ بھی جائز ہے اور جو شخص لباس زینت پہن کر نماز پڑھے یا پڑھائے گویا اس نے ایک فضیلت پر عمل کیا۔ آئمہ کرام کو لباس (زینت) مسنون و مستحب پہن کر ہی نماز پڑھانی چاہیے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ لباس زینت یا لباسِ مسنون ہے کیا؟

لباس مسنون:

ظاہر ہے لباس مسنون و زیت وہی ہوگا جو نبی اکرم ﷺ نے زیب تن فرمایا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی جسے حضور کی اتباع و پیروی میں استعمال کیا۔

امام بخاری نے صحابہ و تابعین کے نمازوں کے دوران لباس کا ذکر کرتے ہوئے ایک روایت اس طرح بیان کی ہے:

قال الحسن کان القوم یسجدون علی العمامة و القلنسوة و یداه فی کمه ۔

یعنی حضرت حسنؒ (بصری) کہتے ہیں کہ لوگ (صحابہ و تابعین) عمامہ اور ٹوپی پر سجدہ کرتے تھے اور ان کے ہاتھ آستینوں میں ہوتے تھے۔ (۱۰)

حافظ الہیثمی ایک روایت لباسِ نماز کے سلسلہ میں یوں بیان کرتے ہیں کہ:

عن عاصم بن کلیب عن ابیه عن خاله قال اتیت النبی ﷺ

فی الشتاء فوجدتھم یصلون فی البرانس والاکسیة و ایدیھم فیھا۔ (۱۱)

یعنی کلیب کے والد اپنے ماموں سے روایت کرتے ہیں کہ "میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سردیوں میں حاضر ہوا وہ سب ٹوپیاں پہنے ہوئے اور چادریں اوڑھے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے اور ان کے ہاتھ ان کی چادروں میں تھے۔"

اس روایت سے معلوم ہوا کہ نماز میں صحابہ کرام کا لباس کچھ غیر معمولی نہ ہوتا تھا بلکہ وہی عام اور سادہ لباس جو وہ اپنی روزمرہ زندگی میں استعمال کرتے تھے اس میں نمازیں بھی ادا کرتے تھے اور ٹوپی پہن کر نماز پڑھنے کا جواز بھی اس حدیث سے ثابت ہوا۔ پھر جب ٹوپی پہن کر نماز پڑھی جاسکتی ہے تو پڑھائی کیوں نہیں جاسکتی؟ یہ جو بعض حلقوں میں دستار ہی میں نماز پڑھانے کی پابندی ہے اس کی دلیل کیا ہے؟ جبکہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ایسی کوئی پابندی عائد نہیں کی۔

خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ عمامہ کا التزام نہیں فرمایا بلکہ آپ کثرت سے عمامہ کے استعمال کے ساتھ ساتھ ٹوپی بھی استعمال فرماتے تھے۔ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے کہ:

کان یلبس القلانس تحت العمائم و بغیر العمائم و یلبس العمائم بغیر قلانس (۱۲)

یعنی نبی اکرم ﷺ ٹوپی عمامہ کے نیچے پہنتے تھے اور ٹوپی بغیر عمامہ کے (بھی) پہنتے تھے اور عمامہ بغیر ٹوپی کے (بھی) پہنتے تھے۔

ان احادیث و آثار سے یہ بات ثابت ہوئی کہ امام کے لئے کوئی مخصوص لباس نہیں بلکہ جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ و تابعین سے ثابت ہے وہی اصل ہے کہ ننگے سر نماز سے اجتناب کیا جائے اور ٹوپی یا عمامہ جو بھی چاہیں پہن کر نماز پڑھی اور پڑھائی جاسکتی ہے۔

اسی طرح باقی لباس میں بھی اختیار ہے کہ نہ شلوار و پاجامہ پہننا فرض ہے اور نہ تہبند کا استعمال شرط۔ ہاں مسنون لباس تہبند و قمیص ہے اور دیگر ہر طرح کا لباس جس سے بدن ڈھک جائے پہن کر نماز ادا کرنا جائز ہے اگر چہ وہ پتلون اور شرٹ ہو۔

چنانچہ کسی امام کو اس بات کا پابند کرنا کہ وہ لازماً شلوار قمیص، پائجامہ کرتہ، یا دستار اور وہ بھی کسی مخصوص رنگ کی پہن کر نماز پڑھائے بے اصل و بے بنیاد بات ہے۔ ہاں اتباع سنت میں اسی طرز اور اسی رنگ کا لباس پہننا افضل ہے جو سنت سے ثابت ہو مگر اسے فرض قرار نہیں دیا جاسکتا اور نہ کسی کو اس کے عدم التزام پر مطعون کیا جاسکتا ہے۔

تنخواہ دار امام:

عوامی حلقوں میں یہ مسئلہ بھی خاصا زیر بحث ہے کہ امام کو تنخواہ لینی جائز ہے یا نہیں، اور تنخواہ دار امام کے پیچھے نماز ہوتی ہے یا نہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ مسئلہ اس معاشرے کے افراد کے مابین زیر بحث رہتا ہے جس کا متوسط طبقہ اور معاشی اعتبار سے اعلیٰ درجہ کا طبقہ اپنے بچوں کو امام مسجد، خطیب، موذن یا دینی مبلغ بنانے کو نہ صرف تیار نہیں بلکہ کسر شان سمجھتا ہے کہ ان کا بچہ مسجد میں لوگوں کو نمازیں پڑھائے یا قرآن کریم کی تعلیم دے یا وعظ و نصیحت کا فریضہ ادا کرے۔ اور اس گریز کا سبب ماسوا اس کے کچھ نہیں کہ یہ طبقہ خود دین کا کام کرنے والوں کو وہ عزت و وقار دینے کو تیار نہیں جو انہیں ملنا چاہئے۔ انہی طبقوں کے لوگ عموماً مساجد کا انتظام و انصرام کرنے والی کمیٹیوں کے ارکان اور کرتا دھرتا ہوتے ہیں اور انہیں خوب معلوم ہے کہ وہ امام مسجد کا جو اکرام کرتے ہیں وہ کس نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے بچوں کو اس قسم کے اکرام کی بھینٹ چڑھانے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔

امام مسجد کی تنخواہ کا معاملہ ایک معاشی مسئلہ ہونے کے ساتھ ساتھ شرعی بھی ہے کیونکہ قرآن کریم میں ہے کہ **وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا** اس سے بعض علماء وفقہاء نے یہ مطلب اخذ کیا کہ دین کا کام کرنے پر اجرت لینا جائز نہیں۔

تفسیر روح المعانی میں علامہ محمود احمد آلوسی حنفی (م ۸۵۵) نے اس آیت کریمہ کی

تفسیر میں لکھا ہے:

"بعض اہل علم نے اس آیت سے قرآن مجید اور دیگر علوم کی تعلیم کی اجرت کے عدم جواز پر استدلال کیا ہے اور اس مسئلہ میں بعض احادیث بھی مروی ہیں جو صحیح نہیں۔ جبکہ صحیح حدیث میں یہ ہے کہ صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ! کیا ہم تعلیم پر اجرت لیں؟ آپؐ نے فرمایا جن چیزوں پر تم اجرت لیتے ہو ان میں سب سے بہتر کتاب اللہ ہے اور اس کے جواز کے سلسلہ میں علماء کے اقوال بکثرت منقول ہیں۔ اگرچہ بعض علماء نے اس کو مکروہ بھی کہا ہے مگر اس آیت میں اس کی کراہت پر کوئی دلیل نہیں۔"

ایک اور دلیل جو قرآن، نماز اور وعظ و تذکیر کی اجرت نہ لینے کے سلسلہ میں پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ دین کا کام کرنا اور دینی تعلیم دینا، فرائض کی جماعت کرانا یہ سب عالم دین پر شرعاً فرض ہے اور فرض کا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے بندوں کے ذمہ نہیں۔ لہٰذا نہ تو امام کو جماعت کرانے کی، نہ معلم کو تعلیم دین دینے کی اور نہ واعظ و خطیب کو وعظ و خطبہ کی تنخواہ لینی چاہئے۔ اس کے جواب میں گزارش ہے کہ یہ سب بات اپنی جگہ درست مگر کسی عالم دین کے لئے یہ کب ضروری ہے کہ وہ دین کی تعلیم کسی مخصوص مدرسہ میں ہی جا کر دے یا کسی مخصوص مسجد میں جا کر نماز پڑھائے اور پھر مخصوص اوقات مثلاً ۸ سے ایک بجے تک پانچ گھنٹے پڑھائے یا فجر کی نماز لازماً سوا پانچ بجے صبح اور عشاء کی نماز سوا نو بجے رات کو ہی پڑھائے اس سے آگے پیچھے ایک منٹ بھی نہ کرے۔ اور مدرسہ میں پڑھانے والا معلم لازمی طور پر وہی نصاب پڑھائے جو اس مدرسہ نے مخصوص کر رکھا ہے اور صرف انہی طلبہ کو پڑھائے جو اس مدرسہ میں اس کی کلاس میں پڑھتے ہوں۔

علامہ غلام رسول سعیدی تنخواہ کے جواز پر گفتگو کرتے ہوئے شرح صحیح مسلم (ج ۲، ۵۷۷) میں لکھتے ہیں:

"جب کوئی ادارہ کسی عالم دین کو مخصوص مدرسہ کے مخصوص اوقات میں

مخصوص نصاب کے مطابق طلبہ کو تعلیم دینے کا پابند کرے گا یا مخصوص مسجد کے مخصوص اوقات میں لوگوں کو نماز پڑھانے یا اذان دینے کا پابند کرے گا تو وہ معاوضہ ان خصوصیات اور پابندیوں کے مقابلہ میں ہوگا۔ نفس عبادات کا معاوضہ نہیں ہوگا۔ اور نہ کسی عالم کو یہ خیال کرنا چاہئے کہ وہ ان عبادات کا معاوضہ لے رہا ہے، عالم کو جس جگہ جس وقت اور جن لوگوں کا پابند کیا جاتا ہے وہ اس جگہ، اس وقت اور ان لوگوں کی پابندی کرنے کا معاوضہ لیتا ہے۔ (۱۳)

اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان دینی فرائض کو ادا کرنے میں عالم دین جو وقت صرف کرتا ہے وہ معاوضہ اس وقت کا ہوتا ہے ان عبادات کا معاوضہ نہیں ہوتا۔ یا ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں اس کی جو توانائی خرچ ہوتی ہے یہ معاوضہ اس توانائی کا ہے ان عبادات کا معاوضہ نہیں ہے۔'' (۱۴)

امام کی تنخواہ اور دینی خدمات انجام دینے والوں کے لئے وظیفہ، معاوضہ یا اجرت وغیرہ لینے کے جواز کے سلسلہ میں سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا یہ قول ایک رہنما اصول ہے جس میں آپ نے فرمایا:

''اگر میں اس وقت کوئی اور ذریعہ معاش اختیار کرتا تو وہ میری ضروریات کا کفیل ہوتا۔'' (۱۵)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب حضرت ابوبکرؓ خلیفہ بن گئے تو انہوں نے فرمایا ''میری قوم کو معلوم ہے کہ میرا کسب (تجارت) میرے اہل وعیال کی کفالت کے لئے ناکافی نہیں تھا اور اب میں مسلمانوں کے معاملات میں مشغول ہو گیا ہوں، اب ابوبکر کے اہل وعیال بیت المال سے کھائیں گے اور ابوبکر مسلمانوں کے لئے کسب کرے گا۔'' (۱۶)

خلفائے راشدین پانچ وقت کی نمازیں اور جمعہ پڑھاتے تھے، وعظ ونصیحت کرتے

تھے، مقدمات کے فیصلے کرتے تھے اور ان تمام خدمات کے عوض ان کو بیت المال سے وظیفہ دیا جاتا تھا، ان نفوس قدسیہ کا عمل اس بات کی قوی دلیل ہے کہ دینی خدمات کے عوض ضروریات زندگی (معاشی ضروریات) پوری کرنے کی خاطر معاوضہ لینا جائز ہے، ورنہ یہ لوگ جو حد درجہ محتاط اور تقویٰ کے اعلیٰ ترین مرتبہ پر فائز تھے کسی صورت بھی بیت المال (سرکاری خزانہ) سے کچھ لینا گوارا نہ کرتے۔

تنخواہ کے جواز کے ان دلائل کے باوجود میں یہ کہتا ہوں کہ دین کا کام کرنے والے لوگوں اور خصوصاً ائمہ مساجد کو یہ چاہئے کہ وہ امامت وخطابت کو ذریعہ روزگار بنانے کے بجائے، ان خدمات کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ کوئی اور ذریعہ معاش بھی رکھیں تا کہ اس مادی دور میں خوشحال زندگی گزار سکیں۔ سفلی خیالات اور گھٹیا سوچ رکھنے والوں کے دست نگر ہونے سے اپنے آپ کو بچائیں اور اسکول وکالج کی ملازمت یا دیگر معزز پیشوں میں سے کوئی پیشہ بھی ساتھ ساتھ اختیار فرمائیں تو وہ زیادہ باوقار اور ٹھوس طریقے سے دین کی خدمت کر سکیں گے۔ قدیم زمانہ میں بھی جب بیت المال نہ رہا یا بیت المال سے ائمہ کے وظائف بند ہو گئے تو ائمہ وخطباء، طبابت وتدریس کا پیشہ اختیار کرتے تھے۔ (تفصیلات اگلے صفحات میں ملاحظہ کیجئے) اور آج بھی الحمدللہ بہت سے خادمان دین متین دیگر ذرائع روزگار اختیار کئے ہوئے ہیں اور مساجد سے بغیر طے کئے ہوئے جو خدمت ان کی ہو جاتی ہے اس پر قناعت کرتے ہیں اور اس میں اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑا وقار دیا ہے۔

تاہم مساجد کی انتظامیہ اور دیگر رفاہی وفلاحی اداروں کو دین کا کام کرنے والے لوگوں کی اعانت وسرپرستی کرنی چاہئے اور ان کی ضروریات زندگی کا خیال رکھنا چاہئے اور ائمہ وخطباء وموذنین وغیرہ کو اتنے وظائف تو دینے چاہئیں جو معاشرہ کے کسی معزز ترین شخص کی ضروریات کی کفالت کے لئے کافی ہوں۔

امام یا ملازم؟

چونکہ اکثر مساجد میں امام کو وظیفہ یا تنخواہ ملتی ہے اس لئے مساجد کی انتظامیہ کے بعض اراکین اور خصوصاً چیئرمین یا صدر وسیکرٹری امام کو مسجد کا بلکہ خود اپنا ملازم خیال کرنے

لگتے ہیں اس بناء پر یہ سوال زیر بحث آتا ہے کہ کیا امام کو ملازم تصور کیا جائے گا یا ایک معزز خدمت گار دین۔

ہمارے خیال میں امام کو ملازم تصور کرنے سے اس کا درجہ ایک روحانی پیشوا و مقتدا سے گر کر ایک ماتحت اور نوکر کا سا ہو جاتا ہے پھر جو شخص امام کو اپنا نوکر اور ملازم سمجھے یعنی نوکروں اور ملازموں کی طرح حقیر جانے اور اسے اپنا مقتدا اور رہنما بھی کہے تو سوچنا پڑے گا کہ اس کی ان نمازوں کا کیا ہوگا جن میں وہ خود آقا ہوا اور جن میں اس نے امام کو ملازموں کی طرح حقیر خیال کیا۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ کوئی شخص اپنے کسی ماتحت یا ملازم کی اقتداء میں نماز پڑھ سکتا ہے مگر یہ یاد رکھے کہ جب اسے امام بنایا گیا تو اپنے سے بہتر سمجھ کر اسے امام بنایا کہ وہ آقا و مالک یا افسر اعلیٰ سے تقویٰ میں برتر ہے اور اگر کم تر سمجھا تو نماز نہ ہوگی۔

مساجد میں امام کو ملازم سمجھنے اور اس کے ساتھ ملازموں جیسا سلوک کرنے کا رواج عام ہو چلا ہے بعض مساجد کی انتظامیہ کے انتظامی سربراہ و اراکین اپنے آپ کو مسجد میں دینی خدمات پر مامور حضرات مثلاً خطیب، امام، نائب امام، مؤذن اور خادم کا آقا سمجھتے ہیں اور ان کو اپنا تابع اور زیردست سمجھتے اور ان پر رعب جمانے اور حکم چلانے کے چکر میں رہتے ہیں۔ مسجد کمیٹی کا چیئرمین یا متولی یہ چاہتا ہے کہ امام اور دیگر عملہ اس کے احکامات کو کسی صورت رد نہ کرے بلکہ بعض کے دماغ میں یہ خبط بھی ہوتا ہے کہ امام و خطیب نمازوں کے بعد ان سے مصافحہ و سلام میں پہل کرے اور وقتاً فوقتاً (ہفتہ عشرہ میں) ان کے در دولت پر حاضری دے۔ بعض چھوٹی مساجد کے امام و مؤذن کو پابند کیا جاتا ہے کہ وہ چیئرمین یا صدر و سیکرٹری کے گھر پر اس کے بچوں کو مفت ٹیوشن بھی پڑھائے۔ کراچی کے سی او ڈی واقع راشد منہاس روڈ کی مسجد کے ایک خطیب کو ایک کرنل صاحب نے تمام نمازیوں کے سامنے مسجد میں اس بات پر سخت سست کہا کہ خطیب صاحب نے نماز و دعاء کے بعد کرنل صاحب کے پاس جا کر ان سے مصافحہ کیوں نہیں کیا افسوس ہے کہ افواج پاکستان کے بعض افسران اللہ کے گھر میں بھی اپنی برتری تسلیم کرانے کا خناس دماغ میں رکھتے ہیں۔

بعض مساجد کی انتظامیہ کے اراکین ایسے دنیا دار اور بنیے ہوتے ہیں کہ وہ امام کو

نمازوں کا حساب کر کے تنخواہ و معاوضہ ادا کرتے ہیں، ہمارے ایک کرم فرما کراچی کے نامی گرامی علماء میں شمار ہوتے ہیں اور شعلہ بیاں مقرر ہیں، ان کا اپنا بیان کردہ واقعہ ہے کہ جب وہ کسی زمانہ میں لانڈھی کی ایک مسجد میں امام و خطیب ہوا کرتے تھے، شہر میں تقاریر کے سلسلہ میں اکثر جانا ہوتا تھا چنانچہ عشاء کی نماز کی امامت کرانے کا موقع بھی اس حساب سے ملتا تھا۔ اور کسی دور کے علاقہ میں تقریر ہو تو مغرب بھی نہ پڑھا پاتے تھے، انتظامیہ کو اس صورتحال سے بڑی کوفت تھی مگر وہ خطیب صاحب کو فارغ بھی نہیں کرنا چاہتے تھے، کئی بار انہوں نے احتجاج کیا اور ہر بار امام صاحب نے انہیں سمجھایا کہ میں ایک مقرر آدمی ہوں اور وعظ کے لئے دعوت دینے والے لوگوں کو انکار نہیں کر سکتا پھر یہ تبلیغ دین کا ایک ذریعہ ہے اس لئے مؤذن نماز پڑھا دیتا ہے اور میں جب کبھی کہیں کوئی پروگرام ہوتا ہے مؤذن کو قائم مقام بنا کر چلا جاتا ہوں۔ مگر انتظامیہ کو کسی کل چین نہ تھا ایک روز خزانچی نے حساب کتاب کر کے بتایا کہ حضرت آپ کی ماہانہ تنخواہ اتنی ہے یومیہ اتنی ہے اور فی نماز اتنی بنتی ہے اب جب بھی آپ کوئی نماز نہیں پڑھائیں گے تو اتنے آنے اتنے پیسے آپ کی تنخواہ سے وضع کر لئے جائیں گے، امام صاحب نے فرمایا ٹھیک ہے اور نوٹ کر لیجئے کہ آئندہ ہر جمعہ کے روز ظہر کی نماز نہیں پڑھایا کروں گا۔ چنانچہ اس واقعہ کے بعد جو جمعہ آیا تو امام صاحب غائب، ہر شخص ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہا ہے کمیٹی والے پریشان ہیں کہ امام صاحب کہیں دوسری جگہ انٹرویو دینے تو نہیں چلے گئے؟ خیر جیسے تیسے جمعہ گزرا اور عصر میں نمازیوں نے امام صاحب سے استفسار اور کمیٹی نے پرزور احتجاج اور باز پرس کی تو انہوں نے فرمایا یہ فیصلہ آپ لوگوں نے خود ہی کیا تھا کہ ہر نماز کی تنخواہ کٹے گی اب آپ کو میری تقریر یا تبلیغ سے کیا واسطہ آپ اتنے آنے اتنے پیسے تنخواہ سے کاٹ لیجئے جو آپ کے حساب سے ایک نماز کے بنتے ہیں۔ خیر نمازیوں کے ملامت کرنے پر بات کمیٹی والوں کی سمجھ میں آ گئی۔

اس طرح کے واقعات بے شمار ہیں اور بڑے بڑے علماء کرام و مفتیان عظام کو امام مسجد ہونے کے ناطے ایسے تجربات سے گزرنا پڑا ہے۔ کئی آئمہ کرام نے اس قسم کے سلوک یا بدسلوکی کا سامنا کیا ہے، نیو میمن مسجد کراچی کی کمیٹی بھی ان نامی گرامی کمیٹیوں میں

شامل ہے جو اپنے امام کی نمازوں کا حساب کر کے اجرت ادا کرتی رہی ہے میرے ایک معزز ومکرم مہربان نے بتایا کہ نواح راولپنڈی میں حضرت مولانا محبّ النبی رحمۃ اللہ علیہ جیسی شخصیت کے ساتھ تو یہ بھی ہوا کہ مسجد کے منتظم نے ان کی نمازوں کے اوقات میں آمد ورفت کا باقاعدہ حساب کیا جس نماز میں وہ جتنے منٹ لیٹ ہوئے ان کو نوٹ کر لیا گیا اور ان منٹوں کو جمع کر کے (مہینے کے آخر میں) گھنٹوں میں تبدیل کر لیا گیا اور اتنے گھنٹوں کا حساب کر کے تنخواہ سے اتنی رقم منہا کر لی گئی۔

یہ تمام شواہد اس بات کو ثابت کرنے کیلئے پیش کیے گئے ہیں کہ اکثر مساجد کے منتظمین ائمہ کو باقاعدہ تنخواہ دار ملازم ہی تصور کرتے ہیں ورنہ بدسلوکی کے ایسے مظاہر سامنے نہ آتے۔

میں اگر اس طرح کے واقعات کو جمع کرنا اور لکھنا شروع کروں تو اس کے لئے کئی دفتر درکار ہوں گے۔ ہمارے ایک دوست نے جو اسٹیل ٹاؤن (کراچی) میں رہتے ہیں بتایا کہ ان کے امام کے ساتھ بھی کمیٹی کا یہی رویہ ہوا اور امامت کی ملازمت کی تنخواہ کا، فی نماز حساب کتاب کر کے بتایا گیا تو انہوں نے کمیٹی سے ازراہ تفنن کہا کہ آئندہ سے جمعہ کے روز ظہر کی نماز نہیں پڑھاؤں گا اور روزانہ پانچ کی بجائے سات نمازیں ہوں گی، پانچ تنخواہ کی اور دو اوور ٹائم (Over Time) کی۔

ہمارے زمانہ طالب علمی میں ہمارے دارالعلوم میں لیاقت آباد (کراچی) کی کسی مسجد کی کمیٹی کے چیئرمین صاحب آئے اور ناظم دارالعلوم سے بات چیت کر کے ایک طالب علم کو امام کے طور پر لے گئے کچھ دنوں بعد وہ طالب علم مسجد چھوڑ کر واپس آ گیا۔ ناظم صاحب نے پوچھا مسجد کیوں چھوڑ دی، کہا وہاں کا چیئرمین کہتا ہے جب آپ رکوع سے سیدھے ہوتے ہیں تو آپ کی قمیص پیچھے اٹک جاتی ہے لہٰذا آپ آئندہ خیال کریں ورنہ ہم آپ کو فارغ کر دیں گے۔ میں نے بہت کہا بھئی میرے جسم کی ساخت ایسی ہے اور کبھی کبھار ایسا ہو جاتا ہے جو اختیاری نہیں، میں کیا کر سکتا ہوں مگر کمیٹی کا چیئرمین بضد ہوا کہ نہیں آئندہ ایسا نہیں ہو گا چنانچہ میں مسجد چھوڑ کر آ گیا ہوں۔

الغرض ہر مسجد کمیٹی کا کوئی نہ کوئی قصہ آپ کو ملے گا (الا ماشاء اللہ) جس سے یہ

مترشح ہوگا کہ کمیٹی اپنے امام کو ملازم ہی گردانتی اور سمجھتی ہے اور اسی قسم کے خیالات اکثر مقتدیوں کے بھی ہوتے ہیں۔ امامت کا منصب ایک اہم دینی منصب ہے جس کے اصل مستحق عالم و فاضل قسم کے ارباب اقتدار ہیں، مگر جب سے صاحبان اقتدار نے علم اور مسجد سے قطع تعلق کرلیا ہے تب سے امام اور حاکم الگ الگ ہونے لگے ہیں۔ ورنہ ہر گاؤں، ہر قصبہ، ہر گلی اور ہر محلہ میں امام وہی ہوتا تھا جو اس علاقہ کا سب سے بڑا سرکاری افسر ہوتا۔ خواہ وہ کوئی جج ہو، ڈپٹی کمشنر ہو، تھانیدار ہو، تحصیل دار ہو یا نمبردار اور سوچئے آج بھی اگر کسی علاقہ کے ایس پی صاحب یا آئی جی صاحب اسی علاقہ کی مرکزی مسجد کے امام بھی ہوں تو کسی مقتدی یا کمیٹی والے کو جرأت ہوگی کہ وہ ان سے کسی قسم کی بداخلاقی کا مظاہرہ کرے؟

موجودہ دور میں امام کی ذمہ داریاں

چوبیس گھنٹے سروس:

امام کا منصب اگرچہ بڑا ہی باوقار اور نہایت ہی معزز ہے مگر فی زمانہ جو صورتحال ہے اس نے امام کو نہ صرف ملازم بلکہ ۲۴ گھنٹے کا پابند ملازم بنا دیا ہے۔ نمازوں کے اوقات کی پابندی تو پہلے ہی لازم تھی مگر بعض مساجد میں امام کے ذمہ محلّہ کے بچوں کو پڑھانے اور صبح و شام دو وقت پڑھانے کی ذمہ داری بھی ہے۔ علاوہ ازیں رات کے وقت بلکہ رات کے کسی بھی حصہ میں کسی کے ہاں کسی کا انتقال ہو جائے تو امام صاحب کے لئے نیند سے جاگ کر میت کا تختہ اور مسجد کی دریاں مردہ کی چارپائی اور دیگر ضروریات فراہم کرنا نہایت اہم ڈیوٹی ہے۔ علاوہ ازیں کسی کے گھر پر آدھی رات کو جنات حملہ آور ہو جائیں یا کسی کی طبیعت بگڑ جائے تو جھاڑ پھونک اور دم درود کے لئے امام کا حاضر ہونا ضروری ہے دن میں کسی بھی وقت کسی کو مسجد سے کچھ لینا لے جانا ہو تو مؤذن یا جہاں مؤذن نہ ہو صرف امام ہو تو امام کا موجود رہنا فرض ہے۔ بات بات پر علماء سے قرآن و حدیث سے دلیل مانگنے والے بتائیں! کیا یہ فرائض امام کے ذمہ قرآن و سنت نے عائد کیے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر کیا یہ منصب امامت کا استحصال نہیں؟

امام یا چوکیدار؟

اکثر مساجد میں دیکھا گیا ہے کہ مسجد کی کوئی چیز چوری ہو جائے یا کام نہ کرے، جیسے کوئی پنکھا نہ چل رہا ہو، یا پانی ٹینک میں نہ ہو، یا دریاں نہ بچھی ہوں، یا کہیں سے رنگ و روغن اتر گیا ہو، یا سپارے موجود نہ ہوں، تو ادنیٰ سے ادنیٰ شخص بھی امام ہی سے پوچھتا ہے کہ ایسا کیوں ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان تمام اشیاء کا امامت سے کیا تعلق ہے؟ امام مسجد نمازوں میں جماعت کی امامت کے لئے مقرر کیا جاتا ہے یا چوکیداری کے لئے؟

امام مسجد اور فاتحہ؟

بریلوی مسلک کی مساجد میں امام مسجد کیلئے ضروری ہے کہ وہ فاتحہ کی ہر مجلس میں شریک ہو کر لہک لہک کر فاتحہ خوانی کرے، اگر وہ فاتحہ خوانی کی کسی مجلس میں عملاً شریک نہ ہو تو وہابی، اور اگر مجبوراً شریک نہ ہو سکا ہو تو فسادی اور اگر شریک ہو جائے اور کھانا نہ کھائے تو دیوبندی، اور اگر کھا لے تو پیٹو ہے۔ فاتحہ خوانی کی مجالس میں یہ توقع بھی کی جاتی ہے کہ امام اپنی طرف سے دس بیس ختم قرآن شامل فاتحہ کرے، گویا فارغ اوقات میں اس کا یہی کام ہے کہ وہ قرآن کی تلاوت محض اس خیال سے کرتا رہے کہ نہ جانے کب کس کے ہاں مرگ ہو جائے اور فاتحہ، تدفین، فاتحہ سوم اور چالیسویں میں ایصال ثواب کیلئے کچھ پیش کرنے کو کہا جائے تو اسے رسوائی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ علاوہ ازیں امام سے یہ توقع بھی کی جاتی ہے کہ اسے مرنے والے کے تمام ورثاء سمیت اس کا پورا خاندانی شجرہ نسب یاد ہو تاکہ جب وہ اختتام فاتحہ پر باآواز بلند دعا کرائے تو سب کے نام لے لے کر بخشش مغفرت، رحمت اور برکت کی دعا کرائے۔

مروجہ فاتحہ خوانی زیادہ سے زیادہ ایک امر مستحب ہے۔ مگر اس پر جس قدر زور ہے اور اس میں کسی بھی عذر سے شریک نہ ہو سکنے والے کے بارے میں جو رائے قائم کی جاتی ہے، خصوصاً امام اگر کسی فاتحہ میں شریک نہ ہوا تو گویا کفر ہو گیا۔ ہمارے ایک دوست نے بتایا کہ ان کے محلّہ کی مسجد کے امام کو محض اس لئے رخصت کر دیا گیا کہ وہ مسجد کمیٹی کے متولی کی عزیزہ کی فاتحہ میں شریک نہ ہو سکا اور بازپرس پر اس نے یہ کہہ دیا کہ میں کسی مصروفیت میں تھا

اور پھر فاتحہ میں شرکت فرض بھی تو نہیں۔ بس اسی جرم کی پاداش میں مسجد سے اس الزام کے ساتھ رخصتی ہوئی کہ امام وہابی ہو گیا ہے۔

ایک اور مسجد کے امام نے بتایا کہ اسے محض اس لئے مسجد سے فارغ کر دیا گیا کہ اس نے فاتحہ کی ایک مجلس میں مروجہ طریقہ سے آیات و سورتوں کی تلاوت کرنے کی بجائے ترتیب قرآن کے مطابق صرف آخری سورتیں پڑھ کر دعا کرا دی جس پر کئی بوڑھوں نے ادھم مچا دیا کہ ہائے ہائے فاتحہ خراب کر دی۔ نکالو اس موذی کو مسجد سے۔

امام مسجد و جنازہ:

نماز جنازہ فرض کفایہ ہے اور امام مسجد کی ذمہ داریوں میں نماز جنازہ پڑھانا اس کی کوئی شرعی ذمہ داری نہیں۔ ہاں ایک اعزازی استحقاق ہے کہ اگر حاکم یا اس کا نمائندہ نہ ہو تو امام محلہ امامت جنازہ کا زیادہ حق دار ہے۔ کسی کے حق کو اس کے ذمہ فرض قرار دینا کتنی بڑی حماقت ہے یہ تو ایسے ہی ہے کہ میاں بیوی کو بوس و کنار کا حق ہے مگر یہ کہا جائے کہ نہیں ان پر بوس و کنار فرض ہے، اس کے بغیر وہ میاں بیوی ہی نہیں ہوں گے۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ نمازِ جنازہ میں شرکت اہل محلہ کے لئے تو ہو فرضِ کفایہ جبکہ امام کے لئے ہو فرض عین، بلکہ صرف یہی نہیں بلکہ اہل محلہ کی اکثریت نمازِ جنازہ کے بعد اپنے اپنے گھروں کو چلی جائے۔ لیکن امام صاحب کا قبرستان تک جانا واجب ہو، اور جو امام نہ جائے اسے مغرور و متکبر اور بے حس قرار دیا جائے۔

حضرات محترم! یہ کہاں کی شریعت اور کون سا دین ہے؟ جو عوام اپنے آئمہ پر لاگو اور نافذ کرنا چاہتے ہیں اور جس کی پابندی نہ کرنے پر انہیں قابل فراغت سمجھتے ہیں۔

امام مسجد و تعویذ گنڈہ:

گنجان آباد علاقوں، کم تعلیم یافتہ بستیوں اور کمزور عقیدہ لوگوں کے محلوں میں خدمت امامت انجام دینے والے امام کا ماہر عملیات و تعویذ گنڈہ ہونا بھی انتہائی ضروری خیال

کیا جاتا ہے۔ اہل محلہ اور خصوصاً خواتین اپنے امام سے یہ توقع رکھتی ہیں کہ ان کے تمام ظاہری و باطنی، روحانی وجسمانی امراض کا علاج امام مسجد کے پاس ہے۔ وہ اگر تعویذ دے گا تو بڑی سے بڑی مشکل آسان ہو جائے گی۔ دشمن زیر ہوگا، محبت کی شادی کامیاب ہوگی، جہاں پیغام بھیجیں گے رشتہ کھنچا چلا آئے گا اور اگر امام تعویذ نہ دے سکتا ہو یا عملیات کے ذریعہ لوگوں کی مشکلات حل نہ کر سکتا ہو تو پھر اسے اس علاقہ میں امام رہنے کا حق حاصل نہیں اور تعویذات کے سلسلہ میں لوگوں کے نظریات بھی بڑے عجیب عجیب ہیں میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ لوگ انسانوں، حیوانوں، درختوں اور پرندوں کی صحتیابی کے لئے تو تعویذ لیتے ہی ہیں گاڑی اور موٹر سائیکل وسکوٹر کی طبیعت خراب ہو جائے تو اس کے لئے بھی مکینک کی بجائے تعویذ ہی کا آسرا لیتے ہیں، ہمارے ایک کرم فرما کے پاس ایک صاحب حاضر ہوئے اور کچھ دیر گفتگو کے بعد انہوں نے آنے والے سے پوچھا اب موٹر سائیکل کیسی چل رہی ہے؟ جواب ملا اب تو ٹھیک ہی ہے پہلے کچھ اڑی کرتی تھی مگر اب صحیح ہے ان کے جانے کے بعد حضرت نے ہمیں بتایا کہ یہ موٹر سائیکل کے لئے تعویذ لے گئے تھے کہ بہت اڑی کرتی ہے۔ تعویذ گنڈے کا کام اب ہر مسلک کے لوگ کرتے ہیں وہ بھی جو اسے جائز سمجھتے ہیں اور وہ بھی جو اسے حرام اور شرک ٹھہراتے ہیں۔ میرے ایک اہل حدیث دوست نے بتایا کہ ان کے ایک اہل حدیث عالم جو گوجرانوالہ میں ہیں یہی کاروبار کرتے ہیں اور لاکھوں میں کھیلتے ہیں۔

امام مسجد و عامل جنات:

دینی مدارس کے نصاب میں لوگ کہتے ہیں کہ بہت سی خامیاں ہیں نصاب مرتب کرنے والوں نے نصاب مرتب کرتے وقت محض ایک پہلو پیش نظر رکھا اور وہ یہ کہ اس نصاب کی تکمیل سے ایک طالب علم اچھا عالم بن کر نکلے، مگر ایک اہم پہلو، ان کی نگاہ سے شاید اوجھل رہ گیا اور وہ یہ کہ مدارس میں اس نصاب کی تکمیل کرنے کے بعد عالم بن کر نکلنے والے شخص کو جس میدان میں عملاً کام کرنا ہے وہ اور اس کی ضروریات (Requirements) یکسر مختلف ہیں۔ لوگوں کو اس سے غرض نہیں کہ ان کا امام عالم ہے یا نہیں، وہ اگر عالم نما ہے تو کافی ہے مگر اسے عامل ضرور ہونا چاہئے۔ محلہ میں کسی کے ہاں کسی

وقت بھی کسی مرد و عورت کو جنات کا عارضہ لاحق ہو جائے یا سایہ کی کسر ہو جائے، یا رات کو بھوت پریت نظر آنے لگیں تو فوری طور پر امام مسجد سے رجوع کیا جاتا ہے۔ امام صاحب اگر عملیات سے واقف ہے تو کچھ جھاڑ پھونک کر دیتا ہے اور اگر نہیں تو یہ طے کر لیا جاتا ہے کہ یہ امام صاحب بس ایسے ہی ہیں ان کے پاس کچھ نہیں۔ امام ایسا ہونا چاہئے جو جنات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے۔ ہمارے خیال میں اب دینی مدارس کے نصاب پر نظر ثانی کرتے ہوئے ''علم الجنات'' ضرور شامل کیا جانا چاہئے۔

امام مسجد و نکاح خواں:

امامت نماز کے ساتھ ساتھ امام کے دیگر فرائض میں سے ایک فریضہ نکاح خوانی بھی ہے، ہر علاقہ و محلہ میں شادی بیاہ ہوتے ہیں۔ اس موقع پر قاضی نکاح اور نکاح رجسٹرار کی ضرورت پیش آتی ہے لہٰذا اکثر و بیشتر امام مسجد نکاح خواں و نکاح رجسٹرار بھی ہوتے ہیں، بہترین امام وہ ہے جو فوری اور ایمر جنسی کال پر نکاح پڑھا دے، لاجواب نکاح خواں وہ ہے جو نکاح پڑھاتے ہوئے دولہا سے کچھ نہ پوچھے، حتیٰ کہ کلمہ و نماز کی بات بھی نہ کرے اور اس کے عقیدے و اعتقاد کے بارے میں بھی سوال نہ کرے، دولہا اگر چہ قادیانی ہو نکاح خواں کو اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہئے کیونکہ جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی، یہ پوچھ کر کہ تمہارا اعتقاد و عقیدہ کیا ہے؟

بے نظیر نکاح خواں وہ ہے جو کاغذات نکاح میں دولہا دلہن کی وہ عمر درج کرے جو اسے بتائی جائے وہ شناختی کارڈ یا دیگر دستاویزات سے اس عمر کی تصدیق نہ چاہے بلکہ نکاح ہو جانے کے بعد اور تمام اندراجات مکمل ہونے کے کچھ عرصہ بعد بھی نکاح فارم میں مطلوبہ تبدیلی سے انکار نہ کرے۔

اچھے امام صاحب وہ ہیں جو راتوں رات اغوا کر کے لائی جانے والی لڑکی کا نکاح بغیر گواہوں کے پڑھا دیں اور اگر گواہ ضروری ہوں تو وہ رازدارانہ طریقے سے اس کا اہتمام بھی کر دیں یا کم از کم اُنہی گواہوں پر اکتفاء کریں جو اغوا کنندہ نے لا کر بٹھا رکھے ہیں۔ امام کو

رات دن ہر وقت جبہ و دستار تان کے رکھنا چاہئے کیونکہ اسے کسی بھی وقت نکاح و جنازہ کے لئے بلایا جا سکتا ہے۔ نکاح خوانی کے سلسلہ میں میرا ذاتی تجربہ ہے کہ بعض لوگ نکاح کی تاریخ طے کرنے کے بعد امام کو عین نکاح والے دن یا اس سے ایک دن قبل اطلاع کریں گے اور توقع رکھیں گے کہ وہ بلا چون و چرا ان کے ساتھ چل دے ایک صاحب میرے پاس نکاح پڑھوانے کے لئے آئے، میں نے پوچھا کب ہے کہا ابھی مغرب کے بعد، میں نے کہا کیوں کوئی ایمرجنسی ہے؟ کہا نہیں، کیوں آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں، میں نے کہا نکاح کی تاریخیں تو نکاح کے موقع سے بہت پہلے طے کی جاتی ہیں۔ پھر لوگ عموماً کارڈ چھپواتے، ہال بک کراتے، کھانے کا آرڈر دیتے اور دعوت نامے تقسیم کرتے ہیں تو کیا آپ نے یہ سب مراحل طے کر لئے، کہا ہاں میں نے کہا صفائی وغیرہ ہو گئی کہا جی ہاں۔ میں نے کہا ٹینٹ شامیانے لگ گئے کہا جی ہاں، میں نے کہا نائی کا انتظام بھی ہو گیا کہا جی ہاں، میں نے کہا تو پھر ایک امام ہی باقی رہ گیا تھا کہ اسے قبل از وقت دعوت دینے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی کہ اس کا کیا ہے جب چاہیں گے کان سے پکڑ کر لے آئیں گے؟ جاؤ میں نہیں پڑھا سکتا ایسا نکاح۔ جو امام کو بے وقعت بنانے والا ہو۔

جس نکاح کے معاملہ میں شک کی بناء پر امام جانے سے گریزاں ہو اس میں اسے لے جانے کے لئے مسجد کمیٹی سے دباؤ ڈلوایا جاتا ہے اور کوئی بعید نہیں کہ بعض کمیٹیوں کے کرتا دھرتا طاقت کے بل بوتے پر ایسے نکاح بھی امام سے پڑھوا لیتے ہوں جن کا انعقاد سرے سے ممتنع ہو۔ مجھے ایک چیئرمین کمیٹی سے سابقہ پڑا جس نے ایک بار مجھے ایک قادیانی گھرانے میں نکاح پڑھانے کے لئے لے جا کھڑا کیا اور ایک بار ایک ایسے نکاح فارم پر مہر لگانے کو کہا جس کے اندراج و مندرجات سے میں واقف تک نہیں تھا۔ میرے انکار پر ان حضرت کو بڑی تکلیف پہنچی۔ (خدا مغفرت کرے اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے)۔

مجھے اپنے ایک دوست (امام) کے ساتھ فیصل آباد کی ایک عدالت میں حاضر ہونے کا موقع ملا جس میں میرے ان دوست پر ایک مقدمہ درج کرایا گیا تھا کہ انہوں نے اغوا شدہ لڑکی کا نکاح پڑھایا ہے۔ مجھے وہ اپنے ساتھ اس کیس کو سمجھنے اور خلاصی کی صورت

پیدا کرنے کی خاطر لے گئے تھے جب فریقین مقدمہ سے ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ پانچ سال قبل لاہور میں یہ نکاح ہوا تھا اور جس محلہ کی مسجد میں ہمارے یہ دوست خطیب و امام تھے اس مسجد کی کمیٹی کے چیئرمین کی تصدیق و دعوت پر یہ نکاح ایک گھر میں ایک سادہ تقریب میں ہوا تھا۔ گواہ موجود تھے، لیکن کچھ عرصہ بعد لڑکی والوں نے مقدمہ ۴۲۰ درج کرا دیا کہ دولہا نے جس لڑکی سے نکاح کیا وہ اس کی سالی تھی اور اسے وہ فیصل آباد سے اغوا کر کے لاہور لایا تھا۔

بتایئے امام کے پاس وہ کونسا آلہ ہے جس سے وہ یہ تصدیق کر سکے کہ نکاح میں پیش کی جانے والی لڑکی اغوا شدہ تو نہیں؟ جب گواہ بھی ہوں، محفل بھی بجی ہو، محلہ کے لوگ موجود ہوں، مسجد کمیٹی کے چیئرمین داعی ہوں۔ اب اس کے بعد کس قسم کی اور کس سے تصدیق کرائی جائے؟

الغرض امام کو ان تمام قسم کے معاملات و واقعات سے دوچار ہونے کے قابل ہونا چاہئے ورنہ وہ کسی مسجد میں کامیابی سے امامت نہیں کر سکتا۔

امام قصاب:

بعض دیہی علاقوں اور شہری مضافات میں امام کے لئے ایک اچھا قصاب یا کم از کم تجربہ کار ذابح ہونا بھی ضروری ہے۔ عید قربان کے موقع پر وہ اپنے گاؤں یا محلہ کے لوگوں کے قربانی کے جانور ذبح کر کے اور مکمل طور پر تیار کر کے نہ دے سکے تو کم از کم ہر شخص کے جانور کی گردن پر چھری چلا کر ذبح کرنے کا کام ضرور انجام دے۔ عید قربان کے علاوہ بھی میں نے لوگوں کو امام کے پاس مرغیاں ذبح کرانے کے لئے آتے دیکھا ہے۔ اگر امام کسی گوٹھ کی مسجد میں امامت کرتا ہو تو امام کو وڈیرے کی گائے ذبح ہوتے وقت دعا کے لئے موجود رہنا لازمی ہے۔

امام غسال:

بعض علاقوں میں مردوں کو نہلانے کی خدمت بھی امام ہی سے لی جاتی ہے اور مردے کے اترے ہوئے کپڑے امام کو ہدیہ کے طور پر اس خیال سے دے دیے جاتے ہیں

کہ اس سے مردہ کی بخشش ہوگی اور اس صدقہ کا (جو مردہ نہلانے کے عوض دیا گیا ہے) ثواب مردہ کی روح کو پہنچے گا۔

مذکورہ بالا تمام اوصاف اور خوبیاں جس امام میں ہوں آج کے دور میں وہ معاشرہ کا کامیاب امام ہے اور جو محض کنز و قدوری پڑھ کر یا دورہ حدیث کے بعد سند فراغ لے کر امامت کے منصب پر فائز ہوا ہو اور اسے مذکورہ بالا امور کی انجام دہی میں تامل ہو وہ زیادہ عرصہ کسی ایک محلہ یا گاؤں میں بطور امام نہیں رہ سکتا إلا ماشاء اللہ۔

مختلف علاقوں اور زبانوں میں امام کیلئے استعمال کئے جانے والے اسماء و القاب

وہ شخص جس نے اپنی جوانی کا قیمتی حصہ علوم دینیہ کی تحصیل و تکمیل میں صرف کیا ہو اور جو طویل جدوجہد اور محنت شاقہ کے بعد مدرسہ سے سند فراغ پا کر مسند امامت و خطابت کے لئے تیار ہوا ہو اسے عملی میدان میں جو عزت ملتی ہے اور جن القاب و اسماء سے یاد کیا جاتا ہے وہ بذات خود اس قدر گھٹیا اور اہانت آمیز ہیں کہ کوئی شخص دل پر پتھر رکھ کر ہی اس پیشہ یا خدمت دین کو اختیار اور قبول کرے گا۔

ایم بی بی ایس کرنے والا نوجوان اپنے کورس کے آغاز ہی سے یہ بات جانتا ہے کہ تکمیل کورس اور حصول ڈگری کے بعد وہ ڈاکٹر کہلائے گا۔ معاشرہ میں اس کا ایک مقام ہوگا اور لوگ اسے قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے اس کا روزگار بھی باعزت اور پیشہ بھی معزز ہے۔

انجینئرنگ پاس کرنے کا خواہش مند نوجوان اس جذبہ سے اپنی تعلیم میں مگن رہتا ہے کہ وہ مستقبل کا انجینئر ہے، فورسز میں تربیت پانے والے نوجوان مستقبل کے پائلٹ، کمانڈوز، ایڈمرل، جنرل، چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور اسی طرح دیگر خوبصورت ٹائیٹل کے عہدوں پر فائز ہونے کی امید میں شاداں و فرحاں ہیں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم طلبہ اپنا ایک مستقبل اپنے ذہن میں رکھتے ہیں۔ مگر مدرسہ کا طالب علم اپنے مستقبل کے سلسلہ میں قطعی پرامید نہیں نہ وہ اپنے ذہن میں کوئی خیالی محل تعمیر کرنے کا روادار ہے کہ اسے دوران تعلیم ہی اچھی طرح اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ یہ نصاب مکمل کر کے ایک بہت

بڑی چیز بھی بن گیا تو زیادہ سے زیادہ وہی ہوگا جو اس کے محترم اساتذہ ہیں اور جو حسنِ سلوک مدرسہ کی انتظامیہ یا مسجد کمیٹی کی طرف سے ان کے استاذ کے ساتھ ہو رہا ہے اس سے اچھا اور بہتر سلوک اس کے ساتھ کہیں ہونے والا نہیں۔

معاشرہ میں ایک عالم کو جو مقام حاصل ہے اس کا اندازہ مختلف علاقوں اور زبانوں میں وہاں کی عام آبادی کی طرف سے ملنے والے القاب و اسماء سے کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ، امام مسجد، خطیب یا کسی عالم کے سامنے اسے ان القاب و اسماء سے یاد نہ کیا جاتا ہو۔ مگر عام گفتگو اور گھریلو بات چیت میں جب اس کا ذکر آتا ہے تو، ملاں جی، ملانہ، مولبی، ملوٹ (مَل وَٹ) وغیرہ میں سے ہی حسب رواج کسی ایک لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

ایسا معاشرہ جہاں عالم کی یہ قدر ہو، وہاں اب بھی اگر کچھ بچے دینی مدارس میں تعلیم و تربیت حاصل کر رہے ہیں تو ان کی مدارس میں موجودگی دو حالتوں میں سے کسی ایک سے خالی نہیں ہے یا انہوں نے اور ان کے والدین نے یہ طے کر لیا ہے کہ پبلک کچھ بھی کہے، لوگ کیسا ہی سلوک کریں، معاشی حالات کیسے ہی ہوں، انہیں دین کی خدمت کا فریضہ انجام دینا ہے اور ان تمام مصائب و مشکلات کے باوجود اصلاحِ احوال و تبلیغ دین کا کام کرنا ہے اور یا پھر ان کے گھریلو حالات، معاشی معاملات ایسے دگرگوں ہیں کہ عصری تعلیم کے لئے ان کے پاس سرمایہ نہیں اور مدرسہ میں دال روٹی و رہائش کے ساتھ ساتھ مفت کی کتابیں اور لباس و جیب خرچ مل جاتا ہے اور آگے چل کر بھی اتنا تو کسی نہ کسی صورت کسی مسجد و مدرسہ سے مل ہی جائے گا اس لئے وہ اس شعبہ میں اپنی زندگی کے کھیلنے کھانے کے دن اور جوانی کی بہاریں گزارنے پر مجبور ہیں۔

ضرورت ہے! ایک عدد فرشتہ صفت عالم امام کی!

جب کسی مسجد سے کوئی امام کسی بھی مجبوری کی وجہ سے رختِ سفر باندھ لیتا ہے تو انتظامیہ اب ایک ایسے نئے امام کی تلاش میں نکلتی ہے جو ان کی ان ضروریات کو پورا کرنے کا اہل ہو جن کا ذکر ہم نے گزشتہ صفحات میں کیا۔ مگر جب وہ کسی دارالعلوم یا عالم کے ہاں تلاش

مطلوب کے سلسلہ میں پہنچتے ہیں تو وہ یہ درخواست پیش کرتے نظر آتے ہیں کہ انہیں ایک فرشتہ صفت عالم کی ضرورت ہے۔ وہ اپنی ترجیحات کس انداز میں پیش کرتے ہیں اس کا اندازہ اس مکالمہ سے ہوگا جس کے شاہدین میں سے ہم ایک ہیں اور جو ایک مہتمم مدرسہ معروف مفتی و عالم کے اور ایک مسجد کمیٹی کے چیئرمین کے مابین ہوا۔

- حضرت ہم ایک امام کے سلسلہ میں حاضر ہوئے ہیں۔
- کہاں کے لئے؟
- لیاقت آباد کی مسجد (فلاں) کے لئے (ہم نے مصلحتاً نام حذف کر دیا ہے)
- پہلے امام صاحب کہاں گئے؟
- حضرت وہ اب بوڑھے ہو گئے ہیں۔
- کیا عمر ہے ان کی؟
- یہی کوئی ۶۵، ۷۰ برس کے ہوں گے۔
- تو کیا آپ لوگ انہیں فارغ کر رہے ہیں؟
- جی ہاں! وہ اب صحیح طرح سے نماز نہیں پڑھا سکتے۔
- (نام پوچھنے کے بعد) ارے وہ تو صحیح سلامت شخص ہیں، بھئی ان کے بعد کس کو لاؤ گے ان کی زبان تو بڑی صاف ہے۔ تقریر بھی ماشاء اللہ اچھی کرتے ہیں۔
- بس حضرت کیا بتاویں، وہ قرأت ذرا دھیمی کرتے ہیں اور ایک آدھ بار کھانس بھی لیتے ہیں اور ہم لوگوں کو یہ اچھا نہیں لگتا، پھر وہ نماز بھی ذرا لمبی پڑھاویں ہیں، اب اس دور میں کون بڑھاپے کی نماز پڑھے گا۔ کوئی اچھی آواز والا امام ہو، پڑھے تو برابر والے گھروں تک آواز جائے، پتا پڑے کہ مسجد میں نماز ہو رہی ہے یہاں تو سب سونا سونا لگے ہے۔
- میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ انہی کو رکھیں اور اس نئے دور میں اب ان جیسا اچھا عالم، پڑھا لکھا، باعمل قسم کا شخص کہاں سے ملے گا۔ ویسے آپ کی مرضی۔

- نہیں حضرت، محلے والے نہیں مانتے۔ اب ہمارے اپنے لونڈے برابر والی مسجد میں سورۃ الرحمٰن سننے جاویں ہیں۔
- اچھا تو پھر اب کیسا امام چاہئے آپ کو؟
- بس اچھی آواز والا ہو اور حافظ بھی ہو کہ رمضان میں تراویح بھی پڑھا دے اور دو تیم بچے پڑھتے ہیں ہماری مسجد میں ان کو بھی پڑھانا دیکھنا ہوگا اور عالم ذرا اچھا ہو کہ مسئلے مسائل ذرا بتا سکے۔ ہاں تقریر اچھی کرنا جانتا ہو کہ اصل تو جمعہ میں ہی لوگ زیادہ تر آتے ہیں اور مسجد کو چندہ بھی اچھی تقریر ہوگی تو ملے گا ورنہ لوگ دوسری مسجد میں چلے جائیں گے جمعہ پڑھنے۔ اور یہیں اپنے ہاں کا ہو تو زیادہ اچھا ہے۔ ورنہ کم از کم اردو بہت اچھی اور لہجہ صاف ہونا چاہئے۔
- اس کے علاوہ کوئی شرط؟
- (اپنے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے) شادی شدہ ہونا چاہئے۔ ہم سب لوگ بچوں والے ہیں محلے کا مسئلہ ہے اور نیک سیرت ہونا چاہئے کل کلاں کوئی مسئلہ نہ ہو جائے۔
- اچھا تو آپ لوگ کتنی خدمت کرتے ہیں؟
- خدمت تو ہم انشاء اللہ پوری پوری کریں گے۔ بس ذرا مسجد کے مالی وسائل اتنے نہیں ہیں۔ جمعہ کا چندہ اور دکانوں کا کرایہ ہے۔ پھر بھی پندرہ سو روپے تک ہم دیں گے۔ اس سے زیادہ کی ہماری ہمت نہیں۔
- آپ کے کتنے بچے ہیں اور کیا کرتے ہیں؟
- اجی ماشاء اللہ چار ہیں، بڑے والا دکان پر بیٹھتا ہے اس سے چھوٹا کالج میں پڑھتا ہے تیسرے نمبر کا اسکول میں ہے اور چھوٹے والا ابھی آٹھویں میں ہے۔
- آپ نے جن شرائط وصفات کا مالک امام مانگا ہے ان شرائط وصفات کا مالک تو ابھی ہمارے پاس کوئی ہے نہیں۔ خصوصاً یہیں کا کوئی ہو یہ اور بھی مشکل ہے کہ یہاں کے لوگ تو اپنے بچوں کو کاروبار میں لگاتے ہیں مدرسہ میں نہیں بٹھاتے۔ ہاں آپ اپنے بچوں میں سے بڑے والے کو ادھر میرے پاس بھیجئے ہم اسے چند برسوں میں لکھا پڑھا دیں گے پھر اس کو امام رکھ لیجئے۔

مندرجہ بالا مکالمے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شہری علاقوں خصوصاً کراچی ایسے بڑے شہر میں مساجد انتظامیہ کی تقرر امام کے سلسلہ میں ترجیحات کیا ہیں۔ مگر یہ ترجیحات بھی بیرونی ہیں، اندرونی وہی ہیں جو ہم اس سے پہلے ذکر کر آئے ہیں عوام کو واقعی ایسے فرشتہ صفت امام کی ضرورت ہے کہ جو دنیا کی تمام برائیوں سے پاک اور ضروریات زندگی تک سے بے نیاز ہو، وہ ایسا نیک سیرت ہو کہ شادی شدہ ہو کر بچوں کا باپ ہو کر پندرہ سو روپے میں خوشحال زندگی گزار سکتا ہو، ظاہر ہے یہ خوبی کسی فرشتہ صفت میں ہی ہو سکتی ہے کہ جو نہ کھائے نہ پیئے نہ جس کے اور لوازمات زندگی ہوں ورنہ فی زمانہ ایک خاندان کے کفیل شخص سے پندرہ سو روپے ماہانہ میں گزر بسر کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے؟

ایک روشن دماغ سے مکالمہ:

شادی کی ایک تقریب میں کھانے کی میز پر رسوماتِ نکاح کے اختتام اور کھانا کھانے کے اعلان کے انتظار میں بیٹھے ہوئے لوگ آپس میں گپ شپ کر رہے تھے کہ ایک صاحب نے ہماری طرف رخ پلٹا اور مولوی نما دیکھ کر دین کے بارے میں اپنی سوجھ بوجھ و بصیرت جتلاتے ہوئے یہ سوال داغ دیا کہ کیا بات ہے کہ ہماری مساجد میں ائمہ و خطباء ابھی تک وہی پرانی طرز کی تقریریں کرتے ہیں جن سے عوام کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی اور لوگ دورانِ تقریر سوتے رہتے ہیں۔ آخر امام جدید دور کے تقاضوں کے مطابق گفتگو کیوں نہیں کرتا؟ پہلے تو ہم نے ذرا تکلف سے کام لیا اور مناسب نہ جانا کہ میز پر بیٹھے لوگوں کے سامنے انہیں کسی بحث میں الجھایا جائے اور بلاوجہ پریشانی سے دوچار کیا جائے۔ مگر جب انہوں نے مسلسل فلسفہ بگھارنے اور علماء و ائمہ کو جاہل مطلق گردانے پر زور دیا تو ہم نے بھی دخل در معقولات کو تقاضائے وقت، اور خاموشی و تکلف کو خلاف مصلحت سمجھتے ہوئے بات شروع کی۔ ہم نے کہا ائمہ کے بارے میں یا دین کی تبلیغ و دعوت کا کام کرنے والے لوگوں کے بارے میں آپ ہی نہیں اکثر روشن خیال اور بیدار مغز لوگوں کو اسی قسم کی شکایات ہیں کہ اکثر ائمہ جدید دور کے تقاضوں سے واقف نہیں مگر آپ کے خیال میں اس کی اصل وجہ کیا ہے؟ فوراً

بولے ”جہالت“ مدارس میں دی جانے والی بے کار تعلیم اور تعلیم دینے والوں کا فقدان اور پھر ان لوگوں کی ذہنی پسماندگی۔

ہم نے کہا ہاں یہ سب باتیں اپنی جگہ، مگر اس موضوع پر گفتگو سے قبل ذرا تعارف ہو جائے۔ پہلے ہم نے اپنا تعارف کرایا تا کہ ان کے دماغ سے ہر داڑھی والے کے بارے میں قائم جہالت کا تصور اور اپنی علمیت کا خمار اتر جائے چنانچہ اس کا اندازہ یوں ہوا کہ اس تعارف کے دوران ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہوتا محسوس ہوا اور نشست کا انداز بھی بدلا۔ پھر ہم نے ان سے ان کا تعارف پوچھا معلوم ہوا کہ پاک پی ڈبلیو ڈی میں انجینئر ہیں اور (رشوت کے مال سے) ایک عدد شوروم کے مالک ہیں۔ ہم نے کہا کتنے بچے ہیں؟ کہا جی تین ہیں۔ کیا کرتے ہیں؟ کہا ایک تو شوروم پہ بیٹھتا ہے، دوسرا ایم بی اے کے لئے امریکہ گیا ہوا ہے، تیسرا ابھی کامرس میں زیر تعلیم ہے۔ میز پر موجود ان کے عزیز انہیں خاں صاحب کہہ کر بات کرتے تھے ہم نے کہا خاں صاحب! آپ مسلمان تو ہیں ناں؟ کہا جی اللہ کا شکر ہے میں مسلمان ہوں، خدانخواستہ آپ کو کیوں شک گزرا؟ میں نے کہا ہاں مجھے یوں شک گزرا کہ آپ نے کہیں انشاء اللہ ماشاء اللہ نہیں کہا، خیر آپ کے بھائی کتنے ہیں؟ کہا ہم پانچ بھائی ہیں، کیا کرتے ہیں؟ سب کاروبار میں ہیں۔ میں انشاء اللہ“ صرف پاک ڈبلیو ڈی میں ملازم ہوں اور اب ریٹائرمنٹ الحمدللہ قریب ہے۔ اللہ کا بڑا شکر ہے ماشاء اللہ سے بچے اپنی اپنی لائن میں سیٹ ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ہم نے کہا آپ کی تعلیم؟ کہا میں نے گریجویشن کیا تھا ویسے میں نے سول ٹیکنالوجی میں ڈپلومہ اور پھر .B.E کیا ہے ہم نے آپ سب بھائیوں اور آپ کے تمام بچوں کو علم دین کی دولت سے محروم رکھا اور آپ لوگ بقدر فرض بھی دین کی معلومات باقاعدہ کسی استاذ سے حاصل نہ کر سکے۔ مدرسہ میں جانا اور پڑھنا تو بعد کی بات ہے۔ ہمارا المیہ ہی یہی ہے کہ ہم خود مدارس کا رخ نہیں کرتے، اپنے بچوں کو بھی ان سے دور رکھتے ہیں۔ کیونکہ ہم انہیں وہ تعلیم اور وہ ڈگری دلانا چاہتے ہیں جو سکہ رائج الوقت کی طرح فوراً کیش کرائی جا سکے اور جس کا معاوضہ خوشحال زندگی کی صورت میں جلد مل جائے۔ اب آپ بتایئے کہ آپ

نے اپنے کسی بچے کو آپ کے والدین نے آپ کو یا آپ کے بھائیوں میں سے کسی کو دینی تعلیم کے لئے کیوں مدرسہ میں داخلہ نہیں دلوایا؟ اب خاں صاحب آئیں بائیں شائیں کرنے لگے۔ ہم نے کہا سیدھا سا جواب ہے کہ اس تعلیم میں مستقبل تاریک نظر آتا تھا اور ملاگیری پر طبیعت آمادہ نہ تھی۔ جبکہ دوسری طرف چمک ہی چمک تھی اور کسی کا طعنہ وغیرہ بھی نہ تھا۔ چنانچہ آپ نے اس لائن کو اختیار کیا اور بچوں کو بھی اسی لائن میں ڈالا۔ اب غور کیجئے معاشرہ میں اکثریت کی صورتحال کیا یہی نہیں؟ تو پھر جب ''آپ جیسے شرفاء'' اور خاندانی لوگوں کے بچے مدارس میں نہیں جائیں گے بلکہ معاشرہ کا (بقول آپ کے) کچرہ اور پسماندہ طبقہ ان مدارس میں جائے گا اور آپ لوگوں کے میل کچیل (زکوٰۃ وصدقہ) کھا کر تعلیم پائے گا تو پھر مساجد میں آپ کو آپ جیسے روشن دماغ امام وخطیب کہاں سے ملیں گے؟

دوسری بات یہ کہ ائمہ حضرات نے مدارس کا جو نصاب پڑھا ہے اس میں عالم بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، سائنس دان، سیاستدان، تاجر، صنعت کار، یا اخبار نویس و کالم نگار نہیں بنایا جاتا۔ ہاں البتہ مدرسہ سے فراغت کے بعد اگر کوئی دوسری لائن اختیار کر لے تو یہ اس کی صوابدید پر ہے۔ کیا کسی انجینئرنگ یونیورسٹی سے بھی کوئی میڈیکل ڈاکٹر یا کسی میڈیکل کالج سے بھی کوئی انجینئر، کسی لاء کالج سے کوئی صنعتکار یا کسی زرعی یونیورسٹی سے کوئی بینکار پیدا ہوا ہے؟ اور کیا آپ یہ توقع رکھتے ہیں کہ میڈیکل کالج میں فلسفہ، سیاست، صنعتکاری و بینک کاری کی تعلیم دی جاتی ہو گی اور کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ ایک ڈاکٹر ایک اچھا حجام اور اچھا موچی بھی ہو، جب یہ نہیں تو پھر دینی مدرسہ کے پڑھے ہوئے سے آپ یہ توقع کیوں کرتے ہیں کہ وہ ایک اچھا سائنسدان بھی ہو اور سائنسی موضوعات پر گفتگو کرے، وہ ایک اچھا سیاستدان ہو اور سیاسیات پر عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق بولے، آپ تو ویسے بھی اس بات کو ناپسند کرتے ہو کہ کوئی عالم سیاست میں آئے یا کسی اور شعبہ میں کسی نمایاں منصب پر فائز ہو۔ اتنی سی گفتگو کے بعد خاں صاحب کا رویہ معذرت خواہانہ ہو گیا اور انہوں نے تسلیم کیا کہ پورا معاشرہ اس خرابی کا ذمہ دار ہے اور یہ کہ ان حالات میں جیسے ائمہ حضرات بھی میسر ہیں غنیمت ہیں۔

امام مسجد کی اصل ذمہ داریاں

امام مسجد کی اصل ذمہ داری نماز پنج گانہ میں امامت کا فریضہ ادا کرنا ہے اور بس۔
لوگوں کے دینی مسائل کے جوابات دینا اور احکامات شرعیہ کے سلسلہ میں ان کی رہنمائی کرنا دراصل امام مسجد کا نہیں خطیب یا عالم کا منصب ہے کیونکہ شریعت نے امام ہونے کیلئے جو شرائط مقرر کی ہیں ان میں اس کا نماز کے مسائل سے واقف ہونا ایک شرط ہے نہ کہ دین کے جمیع احکام سے واقف ہونا اور ہم یہ بات پہلے کہہ آئے ہیں کہ اگر وہ دین کے دیگر احکام و جزئیات سے واقف ہو تو سبحان اللہ، اولیٰ ہے۔ یعنی اگر ایسا امام میسر آئے جو پورا عالم ہو تو یہ علاقہ ومحلہ والوں کی خوش قسمتی ہے۔ لیکن جہاں مکمل عالم نہ ہو وہاں نماز کے مسائل کے علاوہ دیگر شرعی امور میں امام سے سوال کرنا ٹھیک نہیں۔ کیونکہ جب معلوم ہے کہ وہ عالم نہیں پھر اس سے اس طرح کے سوالات کئے جائیں گے تو وہ اپنی عقل سے صحیح غلط جیسا بھی بن پڑے گا جواب دے گا، یا جواب نہ دے سکنے کی صورت میں خواہ مخواہ نادم ہوگا۔
ہاں امام مسجد کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کو نماز میں سستی و غفلت برتنے پر روک ٹوک کرے اور بچوں اور نوجوانوں کو نماز کا اشتیاق دلائے۔ مقررہ اوقات پر پوری نفاست و طہارت کے اہتمام کے ساتھ نماز پڑھائے اور اس بات کا خیال رکھے کہ اس کی

آواز میں' اس کے انداز میں رضائے الٰہی کا حصول پیش نظر ہو' وہ مقتدیوں کو خوش کرنے کی نیت سے خوش الحانی وگلوکاری سے کام نہ لے بلکہ قواعد ترتیل کا لحاظ کرتے ہوئے متوسط آواز سے قرأت کرے۔ اتنی بلند آواز سے زور لگا کر قرأت کرنا کہ جو ''جہر مفرط'' (زیادہ زور سے پڑھنے) کے زمرے میں آتا ہو، مکروہ ہے۔

باجماعت نماز میں امام کتنی قرأت کرے؟

نمازوں میں قرأت کا معاملہ بھی لوگوں نے اپنی صوابدید کے مطابق بنالیا ہے کہیں امام کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ لازمی طور پر مختصر قرأت کرے حالانکہ بظاہر ایسا کوئی عذر نہیں ہوتا کہ امام کو مختصر قرأت پر مجبور کیا جائے۔ کہیں یہ فرمائش کی جاتی ہے کہ وہ فجر کی نماز میں لازماً سورۃ الرحمٰن کی تلاوت کرے۔ نماز تراویح میں امام سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ تیز رفتاری سے پڑھے۔ علیٰ ھذا القیاس۔ مختلف علاقوں میں مختلف طرح کے مطالبات اور مختلف طرز کی پابندیاں امام پر عائد کی جاتی ہیں۔ اور کچھ آئمہ حضرات اپنے ''اجتہاد'' سے کام لیتے ہوئے بھی قرأت کی مقدار میں کمی بیشی کرتے رہتے ہیں۔ لاہور کی ایک درسگاہ میں مغرب کی نماز کی ادائیگی کا موقع ملا۔ امام مسجد نے خوب خوش الحانی اور پوری طاقت وقوت سے (بغیر لاؤڈ اسپیکر کے) طویل سورتوں میں سے آیات تلاوت کیں۔ بعد نماز امام صاحب سے ملاقات ہوئی کسی نے تعارف بھی کرادیا وہ پہلے سے ہمارا نام سن چکے تھے۔ تھوڑی دیر بیٹھنے کو کہا اسی دوران ہم نے ان سے سوال کیا کہ آپ نے مغرب میں طویل قرأت کیوں کی؟ پہلے تو وہ ٹال گئے مگر پھر اصرار پر انہوں نے بتایا کہ مغرب کی نماز ہی میں نمازی زیادہ ہوتے ہیں اور امام کو اس نماز میں ذرا اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملتا ہے۔ اسی طرح کے خیالات اور کئی آئمہ سے بھی سننے کا اتفاق ہو چکا ہے۔ چنانچہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں قرأت کی مقدار سے متعلق شرعی مسئلہ واضح کرنے کی غرض سے فقہاء کے اقوال نقل کئے جائیں۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے۔

''اگر سفر میں اضطرار ہو مثلاً کوئی خوف ہو یا چلنے کی جلدی ہو تو سنت یہ ہے کہ

الحمد کے ساتھ جونسی سورت چاہے پڑھ لے اور اگر حضر میں اضطرار ہو اور وہ یہ ہے کہ وقت تنگ ہو یا اپنی جان کا یا مال کا خوف ہو تو سنت یہ ہے کہ اس قدر پڑھ لے کہ جس سے وقت اور امن فوت نہ ہو جاوے۔ اور سفر میں حالت اختیار ہو مثلاً وقت میں وسعت اور امن اور قرار ہے تو سنت یہ ہے کہ فجر کی نماز میں سورۃ بروج یا اس جیسی کوئی اور سورۃ پڑھے تا کہ سنت قرأت کی رعایت اور رخصتِ سفر کی تخفیف دونوں جمع ہو جائیں۔ اور ظہر میں بھی اسی قدر پڑھے اور عصر اور عشاء میں اس سے کم اور مغرب میں بہت چھوٹی سورتیں پڑھے اور حضر میں سنت یہ ہے کہ فجر کی نماز کی دونوں رکعتوں میں الحمد کے سوا چالیس یا پچاس آیتیں پڑھے اور جامع صغیر میں لکھا ہے کہ ظہر میں بھی مثل فجر کے پڑھے اصل میں ہے کہ اتنی یا اس سے کم پڑھے اور عصر اور عشاء میں الحمد کے سوائے بیس آیتیں پڑھے اور مغرب کی ہر رکعت میں چھوٹی سورۃ پڑھے اور فقہاء نے یہ مستحسن کہا ہے کہ حضر میں فجر اور ظہر کی نماز میں طوال مفصل پڑھے اور عصر اور عشاء میں اوساط مفصل پڑھے اور مغرب میں چھوٹی سورتیں پڑھے۔ طوالِ مفصل سورۂ حجرات سے سورۂ بروج تک کی سورتیں ہیں اور اوساطِ مفصل سورۂ بروج سے لم یکن تک اور چھوٹی سورتیں لم یکن سے آخر تک۔ اور تیمیہ میں ہے کہ اگر مکروہ وقت میں عصر پڑھتا ہو تو بھی ٹھیک یہ ہے کہ قرأت مسنون پوری پڑھے یہ تاتارخانیہ میں لکھا ہے وتر کی نماز میں الحمد کے سوا کوئی اور سورۃ معین نہیں ہے پس جو کچھ پڑھ لے بہتر ہے۔ (۱۷) لیکن نبی ﷺ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی اور قُلْ یٰاَیُّھَا الْکَافِرُوْنَ اور قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ پڑھی ہے پس کبھی تبرکاً یہ سورتیں پڑھے اور کبھی ان کے سوا اور سورتیں پڑھے تا کہ باقی قرآن کے چھوٹ جانے سے بچ جاوے۔ اور قرأت مستحبہ پر زیادتی نہ کرے اور نماز کو جماعت پر بھاری نہ کر دے۔ (۱۸) لیکن پوری سنت اور مستحب قرأت ادا کرنے کے بعد تخفیف کا لحاظ چاہئے اور فجر کی

نماز میں پہلی رکعت میں بہ نسبت دوسری رکعت کے قرأت (۱۹) طویل کرنا
بالاجماع مسنون ہے امام محمد نے کہا ہے کہ میرے نزدیک بہتر یہ ہے کہ سب
نمازوں میں پہلی رکعت کو بہ نسبت دوسری رکعت کے دراز کرے اور اسی پر فتویٰ
ہے یہ زاہدی اور معراج الدرایہ میں لکھا ہے اور حجتہ میں فتویٰ کے واسطے یہی لیا
گیا ہے یہ تاتارخانیہ میں لکھا ہے اور اسی طرح خلاف (۲۰) جمعہ اور عیدین میں
ہے یہ بدائع میں لکھا ہے اور پھر مشائخ کا ایک اور بھی اختلاف ہے بعضوں نے
کہا ہے کہ دونوں رکعتوں میں فرق ایک ثلث اور دو ثلث کا ہو یعنی دو ثلث
قرأت پہلی رکعت میں پڑھے اور ایک ثلث دوسری رکعت میں اور شرح طحاوی
میں ہے کہ پہلی رکعت میں تیس آیتیں پڑھے تو دوسری رکعت میں دس بیس
آیتیں پڑھے یہ محیط میں لکھا ہے یہ بیان اولویت کا تھا اور حکم یہ ہے کہ فرق اگر
بہت ہو مثلاً پہلی رکعت میں ایک یا دو سورۃ پڑھے اور دوسری رکعت میں تین
آیتیں پڑھے تو مضائقہ نہیں یہ ظہیریہ میں لکھا ہے اور جامع صغیر کی بعض شروح
میں مذکور ہے کہ بلاخلاف دوسری رکعت کو پہلی رکعت پر بقدر تین آیتوں کے یا
اس سے زیادہ کے طویل کرنا مکروہ ہے اور اگر اس سے کم طویل کرے تو مکروہ
نہیں۔ یہ خلاصہ میں لکھا ہے مرغینانی نے کہا ہے کہ تطویل کا آیتوں سے اس
وقت حساب ہوتا ہے جب آیتیں برابر ہوں اور اگر آیتیں بڑی چھوٹی ہوں تو
کلمات اور حروف سے تطویل کا حساب کیا جائے گا یہ تبیین میں لکھا ہے اور مکروہ
ہے کہ کسی نماز کے واسطے کوئی سورۃ مقرر کرلے طحاوی اور اسبیجابی نے یہ کہا ہے
کہ یہ حکم اس وقت ہے کہ اس نماز میں اس سورۃ کو اس طرح یقینی واجب سمجھ
لے کہ اس کے سوا اور سورۃ کو ناجائز یا مکروہ سمجھ لے۔ لیکن اگر آسانی کے واسطے
کوئی سورۃ مقرر کرلے یا جو سورۃ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہوئی ہے اس کو تبرکاً
پڑھا کرے تو اس میں کراہت نہیں لیکن اس میں بھی شرط یہ ہے کہ اس کے سوا
کبھی کبھی اور سورۃ بھی پڑھا کرے تاکہ کوئی جاہل یہ نہ سمجھ لے کہ اس کے سوا

اور کوئی سورۃ جائز نہیں یہ تبیین میں لکھا ہے اور افضل یہ ہے کہ فرض کی ہر رکعت میں الحمد کے سوا ایک پوری سورۃ پڑھے اور اگر عاجز ہو تو ایک سورۃ دو رکعتوں میں تمام کر لے یہ خلاصہ میں لکھا ہے اور اگر ایک سورۃ میں سے کچھ ایک رکعت میں پڑھا اور کچھ دوسری رکعت میں تو بعضوں نے کہا ہے مکروہ ہے اور بعضوں نے کہا ہے مکروہ نہیں ہے اور یہی صحیح ہے یہ ظہیریہ میں لکھا ہے لیکن ایسا کرنا نہ چاہئے اور اگر کرے تو کچھ مضائقہ نہیں ہے یہ خلاصہ میں لکھا ہے اگر ایک رکعت میں ایک سورۃ کے بیچ میں سے یا اخیر میں سے پڑھے اور دوسری رکعت میں دوسری سورۃ کے درمیان یا اخیر سے پڑھے تو ظاہر روایت کے بموجب ایسا کرنا نہ چاہئے لیکن اگر کرے تو مضائقہ نہیں یہ ذخیرہ میں لکھا ہے اور حجتہ میں ہے کہ ایک رکعت میں ایک سورۃ کا آخر پڑھا اور دوسری رکعت میں کوئی چھوٹی سورۃ پوری پڑھی مثلاً ایک رکعت میں اٰمَنَ الرَّسُوْلُ کا رکوع پڑھا اور دوسری رکعت میں قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھی تو مکروہ نہیں یہ تاتارخانیہ میں لکھا ہے۔ دونوں رکعتوں میں آخر سورۃ پڑھنا ایسی پوری چھوٹی سورۃ سے افضل ہے۔ جس کی بہ نسبت آخر سورۃ کا ٹکڑا آیتوں میں زیادہ ہو اور اگر چھوٹی پوری سورۃ اس آخر سورۃ سے آیتوں میں زیادہ ہو تو سورۃ قصیرہ کا پڑھنا افضل ہے یہ ذخیرہ میں لکھا ہے اور ایک طویل آیت جیسے آیت المداینہ یا تین چھوٹی آیتیں پڑھنا چاہے تو اس کی اولیت میں بھی اختلاف ہے اور صحیح یہ ہے کہ اگر تین آیتیں ایک چھوٹی سورۃ کے برابر ہو جاویں تو انہیں کا پڑھنا افضل ہے یہ تاتارخانیہ میں لکھا ہے اور اگر ایک رکعت میں ایسی دو سورتیں پڑھے کہ ان دونوں کے درمیان ایک یا کئی سورۃ کا فصل ہے تو مکروہ ہے اور اگر دو رکعتوں میں دو سورتیں پڑھے تو اگر ان دونوں میں کئی سورۃ کا فصل ہے تو مکروہ نہیں اور اگر ایک سورۃ کا فصل ہے تو بعضوں نے کہا ہے مکروہ ہے اور بعضوں نے کہا ہے کہ اگر بڑی سورۃ کا فصل ہے تو مکروہ نہیں یہ محیط میں لکھا ہے جیسے کہ دو چھوٹی سورۃ کہ فصل میں مکروہ نہیں

یہ خلاصہ میں لکھا ہے اور بعضوں نے کہا ہے کہ کسی حالت میں مکروہ نہیں اور اگر ایک رکعت میں ایک سورۃ پڑھی اور دوسری رکعت میں یا اسی رکعت میں اس سے اوپر کی سورۃ پڑھی تو مکروہ ہے اسی طرح اگر ایک رکعت میں ایک آیت پڑھی اور دوسری رکعت میں یا اسی رکعت میں اس سے اوپر کی آیت پڑھی تو مکروہ ہے اور اگر ایک رکعت میں یا دو رکعتوں میں دو آیتیں ایسی پڑھیں جن کے درمیان میں ایک یا کئی آیتوں کا فصل ہے تو ان کا حکم وہی ہے جو سورتوں کا حکم مذکور ہو چکا ہے یہ محیط میں لکھا ہے یہ سارا بیان فرضوں کا تھا سنتوں میں مکروہ نہیں یہ محیط میں لکھا ہے اگر ایک رکعت میں ایک سورۃ پڑھے تو مختار یہ ہے کہ اسی طرح پڑھتا رہے چھوڑ نہ دے یہ ذخیرہ میں لکھا ہے۔ اگر ایک سورۃ شروع کر لے اور ایک یا دو آیتیں پڑھنے کے بعد دوسری سورت شروع کرنے کا ارادہ کیا تو مکروہ ہے اور یہی حکم ہے اس صورت میں کہ آدھی آیت سے کم پڑھ چکا ہے اگرچہ ایک ہی حرف کم ہو اگر رکوع کے واسطے تکبیر کہہ لی پھر اسی قرأت میں اور زیادتی کرنا چاہی تو اگر رکوع نہیں کر لیا ہے تو مضائقہ نہیں یہ خلاصہ میں لکھا ہے۔ اگر صرف الحمد (۲۱) پڑھی یا الحمد کے ساتھ ایک یا دو آیتیں پڑھیں تو یہ مکروہ ہے یہ محیط میں لکھا ہے جو شخص نماز میں سارا قرآن تمام کرے وہ جب معوذتین یعنی سورۃ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ایک رکعت میں پڑھ چکے تو دوسری رکعت میں الحمد کے بعد سورۃ بقرۃ میں سے پڑھے یہ خلاصہ میں لکھا ہے اور حجتہ میں ہے کہ قرآن سات قرأتوں اور سب روایتوں سے پڑھنا جائز ہے لیکن میرے نزدیک ٹھیک یہ ہے کہ عجیب قرأتیں اما لوں کے ساتھ اور جو غریب روایتوں سے ثابت ہوئی ہیں نہ پڑھے یہ تاتار خانیہ میں لکھا ہے۔"

نماز تراویح میں قرأت وتلاوت کا مسئلہ

نماز تراویح میں ختم قرآن کا اہتمام سب سے پہلے حضرت عمر فاروق ؓ نے کیا تا کہ ماہ رمضان میں نمازِ تراویح میں ایک بار مکمل قرآنِ کریم تلاوت کیا جائے' چنانچہ آپ کی قائم کردہ اس سنت پر دنیا بھر کے مسلمان آج بھی عمل پیرا ہیں۔

البتہ آج جس طرح سے ہم نمازِ تراویح میں ختمِ قرآن کرتے ہیں اگر حضرت عمر ؓ اس دور میں ہوتے تو ہمارا یہ اندازِ تلاوت وسماعت قرآن دیکھ کر یا تو اس کی اصلاح کی خاطر بعض آئمہ تراویح اور منتظمین کو کوڑے لگواتے یا اس سلسلے کو سرے سے موقوف فرما دیتے کیونکہ نمازِ تراویح میں جس تیز رفتاری سے قرآن کریم پڑھا جاتا ہے وہ نمازِ تراویح یعنی قیامِ رمضان کی اصل روح کے سراسر منافی ہے۔ نمازِ تراویح یا قیامِ رمضان کا مقصد تو یہ تھا کہ عام مہینوں کی بہ نسبت اس ماہ میں زیادہ دیر تک راتوں کو عبادت کی جائے اور قرآنِ کریم زیادہ اہتمام کے ساتھ کثرت سے تلاوت وسماعت کیا جائے لیکن بد قسمتی سے ہمارے موجودہ معاشرے میں نمازِ تراویح میں ختم قرآن اب ایک رسم سے زیادہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ ایسے حافظ یا امام کے پیچھے نماز تراویح پڑھنا پسند کرتے ہیں جو انہیں جلد از جلد تراویح پڑھا کر فارغ کر دے' ایسے حفاظ کرام کو پکا اور صحیح حافظ سمجھا جاتا ہے جو انتہائی تیز رفتاری سے تلاوتِ قرآن کریں اور اس میں غلطی یا بھول چوک بھی نہ ہو' نوجوان طبقہ خاص طور سے اس

طرف مائل دکھائی دیتا ہے اور ایسی بہت سی مساجد جہاں مناسب رفتار سے ترتیل کے ساتھ' الفاظ کی صحیح ادائیگی کا لحاظ کرتے ہوئے نمازِ تراویح میں تلاوت ہوتی ہو' مقتدیوں کی زیادہ تعداد دکھائی نہیں دیتی لیکن اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ اب سرے سے ایسے لوگ ہی نہیں جو سکون واطمینان سے تراویح میں تلاوتِ کلامِ حکیم حروف کی صحیح ادائیگی کے ساتھ سننا نہ چاہتے ہوں' بلاشبہ ایسے نیک لوگ اب بھی ہیں مگر اکثریت کا حال وہی ہے جو پہلے بیان ہوا۔

نمازِ تراویح میں مروجہ جلد بازی کا نقصان:

نماز کے تمام ارکان کو ٹھہر ٹھہر کر اور سکون سے ادا کرنا تعدیل ارکان کہلاتا ہے۔ فتاویٰ عالمگیری اور فقہ وفتاویٰ کی دیگر کتابوں میں لکھا ہے کہ تعدیل ارکان اعضاء کے ایسے سکون کو کہتے ہیں کہ اعضاء کے سب جوڑ کم از کم ایک بار تسبیح پڑھنے کی مقدار ٹھہر جائیں' تیز رفتاری سے نمازِ تراویح میں یا کسی بھی نماز میں اگر تعدیل ارکان نہ ہو سکے جو کہ واجب ہے تو نماز ہی نہ ہوگی جن مساجد میں تیز رفتاری سے نماز تراویح پڑھی جاتی ہے وہاں یہ بات بطور خاص نوٹ کی گئی ہے کہ رکوع وسجود اور قومہ وجلسہ میں اطمینان وسکون ہی مفقود ہوتا ہے خشوع وخضوع تو بعد کی بات ہے۔ بعض جگہ تو یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ امام نے نیت باندھ کر سورۃ فاتحہ بھی پڑھ لی اور مقتدی ابھی ثناء نہیں پڑھنے پائے۔

ایسی نماز سے کیا حاصل جس سے روحِ نماز ہی غائب ہو اور پورا زور کسی نہ کسی طرح بیس رکعت کی تعداد پوری کرنے اور ان میں جلد از جلد سوا یا ڈیڑھ پارہ ختم کرنے پر صرف ہو رہا ہو' خدارا اس عمل کی حوصلہ شکنی کیجیے' آئمہ تراویح کو اس بات کا پابند کیجیے کہ وہ تیز رفتاری سے نماز نہ پڑھائیں۔ نوجوانوں اور اپنے بچوں اور ساتھیوں کو اس بات پر آمادہ کیجیے کہ وہ اطمینان وسکون سے نماز پڑھنے کو ترجیح دیں۔ میں تو یہ کہوں گا کہ اطمینان وسکون سے پڑھی ہوئی دو رکعتیں' جلد بازی اور بے سکونی کی بیس تراویح سے کہیں افضل ہیں۔ اسی طرح چھوٹی سورتوں کی پرسکون تلاوت سے ادا کی گئی تراویح کی نماز تیز رفتاری' جلد بازی اور بے سکونی کی ان بیس رکعات سے افضل ہے جن میں آداب وقواعد تلاوت کا لحاظ کیے بغیر کسی طرح لشتم پشتم ختم قرآن کرنا مقصود ہے۔

جلد بازی اور تیز رفتاری سے نماز نہیں ہوتی:

جو لوگ تراویح میں تیز رفتاری سے قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں یا جو تیز رفتار تلاوت سننا پسند کرتے ہیں تاکہ تراویح سے جلد فارغ ہو جائیں۔ انہیں یہ بات بھی جان لینی چاہئے کہ اتنی تیز رفتاری سے قرآن کریم کی تلاوت کرنا جس سے الفاظ پورے ادا نہ ہوں یا حروف اپنے صحیح مخارج وصفات کے ساتھ ادا نہ ہوں یا مدوشد وغیرہ کا خیال نہ رہے یا وقف' وصل اور فصل کے قاعدوں کو نظر انداز کر دیا جائے جائز نہیں اور ایسی تلاوت کرنے والے کی نماز نہیں ہوتی۔ جب اس کی نہیں ہو گی جو پڑھا رہا ہے تو ان مقتدیوں کی بھی نہیں ہو گی جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ امام تلاوت کے آداب کا لحاظ کئے بغیر پڑھ رہا ہے اس کے پیچھے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں کیونکہ نماز میں سکون اور طمانیت شرط ہے جو خشوع وخضوع کا باعث بنتی ہے اور اگر بے سکونی اور جلد بازی کا مظاہرہ ہوا تو ایسی نماز کا کوئی فائدہ نہیں۔

قرآن سنانے کی اجرت:

نماز تراویح میں قرآن سنانے کی اجرت مقرر کرنا ایسی قباحت ہے جو معاشرے میں تیزی سے پھیلی ہے' بعض مساجد میں تو ایسے اللہ والے لوگ مل جاتے ہیں جو بغیر کسی معاوضے کے قرآن کریم سنانے کو تیار ہوتے ہیں تاہم ایسی مساجد کی بھی کمی نہیں جہاں پہلے سے حافظ/ قاری صاحب سے باقاعدہ اجرت طے کی جاتی ہے جسے عرف عام میں خدمت کا نام دیا جاتا ہے۔ بعض حفاظ کرام (اللہ انہیں معاف کرے) طے کئے بغیر قرآن سنانے پر تیار ہی نہیں ہوتے۔ کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ حافظ صاحب طے تو نہیں کرتے مگر انہیں اندازہ ہوتا ہے کہ اس محلے سے اتنی رقم اختتام تراویح پر ملنے کی توقع ہے پھر اگر توقع سے کم ملے تو اس پر قناعت کے بجائے برملا اظہار ناراضگی وبرہمی بھی فرماتے ہیں۔ نماز تراویح کے لئے یا قرآن پڑھنے یا سنانے کے لئے اجرت پیشگی طے اور مقرر کرنا صحیح نہیں اور ایسے امام کے پیچھے نماز نہیں ہوتی جو قرآن سنانے کی اجرت مقرر کرتا یا کرواتا ہے۔ لہٰذا مساجد کی انتظامیہ' کمیٹیوں اور حفاظ کرام سے بصد احترام درخواست ہے کہ وہ قرآن سنانے کی اجرت طے کر کے لوگوں کی نمازیں خراب کرنے سے باز رہیں۔

لاؤڈ اسپیکر کے استعمال پر پابندی لگنی چاہیے:

رمضان المبارک میں اکثر مساجد میں نمازِ تراویح میں لاؤڈ اسپیکر استعمال کیے جاتے ہیں' لاؤڈ اسپیکر کا استعمال شرعاً جائز ہے یا ناجائز یہ بذاتِ خود ایک نزاعی مسئلہ ہے تاہم نظریہ ضرورت یعنی زیادہ سامعین ومقتدین تک آواز پہنچانے کی غرض سے اکثر علماء نے اسے جائز قرار دیا ہے لیکن اس جواز سے جو بے جا فائدہ اٹھایا جارہا ہے وہ حدِ جواز سے تجاوز ہے' شہری محلوں میں مساجد عموماً قریب ہوتی ہیں اور لاؤڈ اسپیکر کی آواز تیز ہوتی ہے جس سے ایک مسجد کی نمازِ تراویح کی آواز دوسری میں باآسانی پہنچ کر وہاں کے نمازیوں کے لئے باعث تکلیف بنتی ہے۔ نیز مساجد کی انتظامیہ اور منتظمین کو اللہ ہدایت دے تو انہیں یہ بات سمجھنی چاہئے کہ جس طرح مساجد میں مرد حضرات نماز تراویح میں مشغول ہیں اسی طرح گھروں میں خواتین بھی نماز ادا کرتی ہیں' لاؤڈ اسپیکر کی تیز آواز ان کی نماز میں یقینی خلل کا باعث بنتی ہے علاوہ ازیں تلاوت کے بارے میں حکم یہ ہے کہ جب تلاوت ہورہی ہو تو سامع خاموش ہوکر اسے سنے اب علماء کرام سے یہ دریافت کرنا ہے کہ خواتین جن تک لاؤڈ اسپیکر کی آواز پہنچ رہی ہے وہ اس آواز پر توجہ دیں اور اس تلاوت کو سنیں جو آپ انہیں زبردستی سنوا رہے ہیں یا اپنی نماز پڑھیں؟

آپ خود اپنی اداؤں پہ ذرا غور کریں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

براہ کرم مساجد میں اوپر کے لاؤڈ اسپیکر جن کی آواز باہر جاتی ہے' نماز تراویح کے دوران تو بند رکھئے تاکہ گھروں پر موجود بوڑھے اور خواتین بھی اپنی نماز سکون سے ادا کرسکیں' ہاں البتہ مسجد میں موجود تمام لوگوں تک آوازِ تلاوت پہنچانے کی غرض سے (اگرچہ اس کے آپ شرعاً مکلف نہیں) صرف اندرونی اسپیکر استعمال کرلیا کریں تو بہت سوں کا بھلا ہو۔ بیرونی اسپیکر پر یہ پابندی مساجد کی انتظامیہ اور ائمہ حضرات مل جل کر خود ہی لگالیں تو بہتر ہے ورنہ عام مسلمانوں کے مطالبے پر اگر کبھی کوئی حکومت یہ پابندی لگائے گی تو اسے مداخلت فی الدین گردانا جائے گا اور بدمزگی پیدا ہوگی۔

تین روزہ...... چھ روزہ...... دس روزہ تراویح:

رمضان المبارک میں بڑے بڑے پوسٹر اور اشتہارات کچھ ان عنوانات کے ساتھ چھپتے ہیں' تین روزہ تراویح' چھ روزہ تراویح' دس روزہ تراویح کا اہتمام وغیرہ وغیرہ۔

عام لوگ بالخصوص نوجوان طبقہ ایسے پروگراموں میں زیادہ پیش پیش ہوتا ہے اگرچہ اس طرح ختم قرآن پر شرعاً کوئی پابندی نہیں لیکن آپ مانیں یا نہ مانیں کہ اس عمل خیر سے بےعملی کا جو پہلو برآمد ہوتا ہے وہ زیادہ خطرناک ہے کیونکہ بعض نوجوان یہ سمجھنے لگے ہیں کہ تین روزہ یا چھ روزہ تراویح میں اگر ختمِ قرآن ہو جائے اور اس میں شمولیت کر لی جائے تو پھر رمضان کی باقی راتوں میں تراویح پڑھنے کی ضرورت نہیں رہتی اور عملاً ایسا ہو رہا ہے کہ چھ روزہ تراویح میں شامل ہونے والے اکثر نوجوان باقی ایامِ رمضان میں مسجد کا رخ نہیں کرتے' یاد رہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے اس عمل کو پسند کیا ہے جو اگرچہ تھوڑا ہو مگر اس پر مداومت یا تسلسل رہے اور اس کے مقابلے میں ایسا نیک عمل جو زور و شور سے ہو مگر اس پر مداومت نہ کی جا سکے اور تھوڑے عرصے بعد اس کے اثرات زائل ہو جائیں وہ بہر کیف نظرِ استحسان سے نہیں دیکھا جائے گا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ "نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ عمل وہ ہے جس پر زیادہ دوام ہو خواہ وہ عمل کم ہی ہو" (صحیح مسلم) نماز تراویح پر مداومت اور رمضان کی تمام راتوں میں قیام اور وہ بھی اطمینان و سکون کے ساتھ جبھی ہو سکتا ہے جب سکون و اطمینان کے حصول کے جو طریقے ہیں ان پر عمل کیا جائے اور ایسے تمام طور طریقوں سے اجتناب کیا جائے جو اس ماہِ مقدس کی مخصوص عبادت (قیام) تراویح میں بےسکونی و بےاطمینانی کا باعث بنتے ہوں۔

رمضان کی راتوں میں یہ بات بھی نوٹ کی گئی ہے کہ شروع کی تین چار راتوں میں مساجد میں نمازیوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے جو آہستہ آہستہ کم ہو کر نصف تک جا پہنچتی ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ جو طویل نمازیں پڑھنے کے عادی نہیں یا سرے سے نماز ہی نہیں پڑھتے مگر احترام رمضان و حبسِ شیطان کی وجہ سے مساجد میں آنے لگتے

ہیں تین چار رات مسلسل ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹہ قیام کر کے تھک جاتے ہیں اور پھر آنا چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر ایسا اہتمام ہو کہ ہر محلہ میں کم از کم ایک مسجد ایسی ہو جہاں چھوٹی سورتوں سے نماز تراویح پڑھانے کا انتظام ہو تو عبادت کی خاطر رمضان میں مسجد کی طرف اٹھنے والے یہ قدم جو دو چار دنوں میں تھک کر رک جاتے ہیں ان میں دوام اور استقامت پیدا کی جاسکتی ہے اور اگر آئمہ حضرات ذرا سی توجہ دیں تو ان میں سے بہت سے لوگ ایسے ہوں گے جو اپنے عمل میں مداومت (ہمیشگی) پیدا کرنے کے خوگر ہو جائیں گے اور ایک ماہ کا یہ کورس انہیں رمضان کے بعد بھی عبادت کی طرف مائل ہی رکھے گا۔

نوافل میں حاضر فرائض سے غائب:

بعض لوگ رمضان کی راتوں میں نمازِ تراویح میں تو بڑے اہتمام اور ذوق وشوق سے شامل ہوتے ہیں مگر سحری کھانے کے بعد نیند سے مغلوب ہو کر فجر کی نماز جماعت سے اور وقت پر ادا نہیں کر پاتے اس بات کا خاص خیال رکھا جانا چاہئے کہ نوافل کی وجہ سے کوئی فرض نہ چھوٹنے پائے دوسری طرف بعض حضرات جو رمضان کی راتوں میں شب بیداری کی دولت لوٹنا چاہتے ہیں وہ دن کے اوقات میں اپنے فرائضِ منصبی (ڈیوٹی) صحیح طور پر ادا کرنے کے بجائے چھپ چھپا کر سونے کی کوشش کرتے ہیں یا دیر سے ڈیوٹی پر جاتے اور آنکھ بچا کر جلد نکل جانے کی کوشش کرتے ہیں جس سے رزقِ حلال کمانے میں جو دیانتداری ومحنت مطلوب ہے وہ نہیں ہو پاتی اور یوں نفلی عبادت کی وجہ سے حقوق العباد میں کمی ہو جاتی ہے جو کسی بھی صورت مستحسن نہیں، ضرورت اس امر کی ہے کہ نفلی عبادات میں اس طرح وقت لگایا جائے کہ فرائض خواہ وہ حقوق اللہ سے متعلق ہوں یا حقوق العباد سے متعلق، متاثر نہ ہونے پائیں۔

نمازِ تراویح کا حقیقی لطف جبھی حاصل ہو سکتا ہے کہ جب اس کا اصل مقصد پیش نظر رہے اور وہ ہے حقوق اللہ وحقوق العباد ادا کرتے ہوئے، فرائض وواجبات کی پابندی کے ساتھ ساتھ ماہِ رمضان میں اضافی طور پر قیام اللیل کی کوشش کرنا اور کامل اطمینان وسکون اور خشوع وخضوع سے نمازِ تراویح میں کلامِ حکیم کی سماعت کرنا تاکہ سابقہ گناہوں کی بخشش ہو سکے۔

قرأت میں بھول چوک یا غلطی سے متعلق احکام:

دورانِ قرأت کسی بھی امام سے بھول چوک یا غلطی ہونا فطری امر ہے اور طویل قرأت کے دوران اس کے امکانات اور بھی بڑھ جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں درج ذیل فقہی احکام کا جاننا از بس ضروری ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

قاری کی لغزشوں میں سے یہ ہے کہ ایک کلمہ کے ایک حرف کو دوسرے کلمہ کے حرف سے ملایا مثلاً اِیَّاکَ نَعْبُدُ اس طرح پڑھا کہ کاف نون سے مل گیا یا غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ اس طرح پڑھا کہ بے عین سے مل گیا یا سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ اس طرح پڑھا کہ اللہ کی ہ لام سے مل گئی تو صحیح یہ ہے کہ اگرچہ عمداً پڑھے نماز فاسد نہ ہوگی یہ خلاصہ میں لکھا ہے اور منجملہ ان کے ایک حرف کی جگہ دوسرے حرف کا ذکر کرنا ہے ایک حرف کی جگہ دوسرا حرف ذکر کیا مثلاً اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ کی جگہ اِنَّ الْمُسْلِمُوْنَ اور اِنَّ الظّٰلِمِیْنَ کی جگہ اِنَّ الظّٰلِمُوْنَ پڑھا تو نماز فاسد نہ ہوگی اور اگر معنی بدل گئے پس اگر وہ دونوں ایسے حرف تھے کہ ان میں آسانی سے جدائی ممکن تھی جیسے کہ طا اور صاد پس اگر کسی نے طالحات کی جگہ صالحات پڑھ دیا تو سب کے نزدیک نماز فاسد ہو جائے گی اور اگر وہ دونوں حرف ایسے تھے کہ ان میں بغیر مشقت فرق نہیں ہو سکتا تھا جیسے کہ ظا اور ضاد اور صاد اور سین اور طا اور تا۔ اس میں مشائخ کا اختلاف ہے اکثر کا قول یہ ہے کہ نماز فاسد نہ ہوگی یہ فتاویٰ قاضی خان میں لکھا ہے اور اکثر مشائخ نے اسی پر فتویٰ دیا ہے۔ امام ابو الحسن اور قاضی امام ابو عاصم نے کہا ہے کہ اگر عمداً ایسا کرے گا تو نماز فاسد ہو جائے گی اور اگر اتفاقاً اس کی زبان سے نکل گیا یا ان میں تمیز نہیں جانتا تو فاسد نہ ہوگی اور یہی سب قولوں میں ٹھیک اور مختار ہے۔ یہ وجیز میں لکھا ہے جو کردری کی تصنیف ہے۔ جو شخص حرفوں کو اچھی طرح (۲۲) ادا نہیں کر سکتا تو چاہئے کہ کوشش کرے اور اس میں معذور نہ ہوگا پس اگر بعض حروف میں اس کی زبان جاری نہیں ہوتی تو اگر اس کو کوئی ایسی آیت نہ ملے جس میں یہ حرف نہ ہوں تو نماز اس کی سب کے نزدیک جائز ہوگی مگر اس کو چاہئے کہ دوسرے کی امامت نہ کرے اور اگر اس کو کوئی ایسی آیت ملے کہ جس میں یہ حروف نہ ہوں اور اس کو پڑھے تو سب کے نزدیک جائز ہوگی اور اگر وہی آیت پڑھے کہ

جس میں یہ حروف ہیں تو بعضوں نے کہا ہے کہ نماز اس کی جائز نہ ہوگی یہ فتاویٰ قاضی خان
میں لکھا ہے اور یہی صحیح ہے یہ محیط میں لکھا ہے اور منجملہ ان کے حرف کا حذف کر دینا ہے اگر
حذف بطور ایجاز وترخیم کے ہے تو اگر اس کی شرطیں موجود ہیں مثلاً یوں پڑھا وتادوا یا مال؟ تو
نماز فاسد نہ ہوگی اور اگر بطور ایجاز وترخیم کے نہ ہو پس اگر معنی نہیں بدلتے مثلاً وَلَقَدْ جَاءَ
هُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنَاتِ پڑھا اور تے چھوڑ دی تو نماز فاسد نہ ہوگی اور اگر معنی بدل جائیں مثلاً
فَمَالَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ کی جگہ فَمَالَهُمْ يُؤْمِنُونَ پڑھ دے تو عامہ مشائخ کے نزدیک نماز فاسد
ہوگی یہ محیط میں لکھا ہے۔ عتابیہ میں ہے کہ یہ اصح ہے یہ تاتارخانیہ میں لکھا ہے۔ اور مثلاً وَ
هُمْ لَا يُظْلَمُونَ اَفَرَاَيْتَ کو لَا يُظْلَمُوْنَ فَرَاَيْتَ پڑھنا اور اَفَرَاَيْتَ کا الف حذف کر دیا
اور يُظْلَمُوْنَ کے نون کو اَفَرَاَيْتَ کی تے سے ملا دیا يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا کو
يَحْسَبُوْنَ نَهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا پڑھا اور انہم کا الف حذف کر کے دونوں نون کو ملا دیا تو
نماز فاسد نہ ہوگی یہ ذخیرہ میں لکھا ہے اور منجملہ ان کے زیادتی حرف کی اگر کوئی حرف بڑھا دیا
تو اگر معنی نہیں بدلتے مثلاً وانہ عن المنکر کو و انہی عن المنکر پڑھا تو عامہ مشائخ کے
نزدیک نماز فاسد نہ ہوگی یہ خلاصہ میں لکھا ہے اور اس طرح اگر هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کو اس
طرح پڑھا کہ هُم کے میم کو جزم کیا اور الَّذِيْنَ کے الف محذوف کو ظاہر کیا تو نماز فاسد نہ ہو
گی یہ محیط میں لکھا ہے اور اگر معنی بدل جاویں مثلاً زرابی کو زرابیب پڑھا یا مثانی کو مثانین
پڑھا یا الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى کی بجائے اِنَّ سَعْيَكُمْ پڑھا اور واو بڑھا دیا يٰسٓ
وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ میں وَ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ پڑھا اور واو
بڑھا دیا تو نماز فاسد ہوگی یہ خلاصہ میں لکھا ہے اور منجملہ ان کے یہ ہے کہ ایک کلمہ کو چھوڑ کر
اس کی جگہ دوسرا کلمہ ایسا پڑھا کہ معنی میں اس کے قریب ہے اور وہ قرآن میں دوسری جگہ
موجود بھی ہے مثلاً علیم کی جگہ حکیم پڑھ دیا تو نماز فاسد نہ ہوگی اور اگر یہ کلمہ قرآن میں
نہیں لیکن معنی اس سے قریب ہے مثلاً التوابین کی جگہ انبیابین پڑھ دیا تو امام ابوحنیفہ اور
امام محمد سے مروی ہے کہ نماز فاسد نہ ہوگی اور امام ابو یوسف سے روایت ہے کہ نماز فاسد ہو
گی اور یہ کلمہ قرآن میں نہ ہو اور نہ دونوں کلمے معنی میں قریب ہوں تو اگر وہ کلمہ تسبیح یا تحمید کا

ذکر کی قسم سے نہیں ہے تو بلا خلاف نماز فاسد ہو گی اور اگر قرآن میں ہے لیکن دونوں کلمے معنی میں قریب نہیں مثلاً اِنَّا کُنَّا فَاصِلِیْنَ میں بجائے فاصلین کے غافلین پڑھا اور اسی طرح کوئی کلمہ بدل دیا جس کے اعتقاد سے کفر ہو جاتا ہے تو عامہ مشائخ کے نزدیک نماز فاسد ہو گی اور امام ابو یوسف کا صحیح مذہب بھی یہی ہے (۲۳) یہ خلاصہ میں لکھا ہے اور اگر کسی چیز کی نسبت ایسی طرف کو کر دی جس کی طرف کو وہ منسوب نہیں تو اگر وہ چیز جس کی طرف کو نسبت کی ہے قرآن میں نہیں مثلاً مریم ابنت غیلان پڑھا تو بلا خلاف نماز فاسد ہو گی اور جس کی طرف کو نسبت کی ہے وہ قرآن میں ہے جیسے مریم ابنة لقمان یا موسیٰ ابن عیسیٰ پڑھا تو امام محمد کے نزدیک نماز فاسد نہ ہو گی اور یہی مذہب ہے عامہ مشائخ کا اور اگر عیسیٰ بن لقمان پڑھا تو نماز فاسد ہوئی اور اگر موسیٰ ابن لقمان پڑھا تو نماز نہ ہو گی اس لئے کہ عیسیٰ کے باپ نہیں اور موسیٰ کا باپ ہے مگر اس نے نام میں خطا کی یہ وجیز میں لکھا ہے جو کردری کی تصنیف ہے اور منجملہ ان کے زیادتی ایسے کلمہ کی ہے جو کسی کلمہ کے عوض میں نہ ہو کلمہ زائدہ سے اگر معنی بدل جائیں اور وہ کلمہ قرآن میں دوسری جگہ موجود ہو مثلاً اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ کو اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ کَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ پڑھے یا موجود نہ ہو مثلاً اِنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ لِیَزْدَادُوْا کو اِنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ لِیَزْدَادُوْا اِثْمًا وَ جَمَالاً. پڑھے تو بلا خلاف نماز فاسد ہو گی اور اگر معنی نہ بدلے تو اگر وہ کلمہ قرآن میں اور جگہ ہے مثلاً اِنَّ اللّٰهَ کَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِیْرًا کو اِنَّ اللّٰهَ کَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِیْرًا م بَصِیْرًا پڑھے تو بالاجماع نماز فاسد نہ ہو گی اور اگر وہ کلمہ قرآن میں موجود نہ ہو مثلاً فیها فاکهة و نَخْلٌ وَّ رُمَّانٌ کو فِیْهَا فَاکِهَةٌ وَ نَخْلٌ وَّ نُفَّاحٌ وَّ رُمَّانٌ پڑھے تو عامہ مشائخ کے نزدیک فاسد نہ ہو گی یہ محیط میں لکھا ہے اور منجملہ ان کے تکرار حرف یا کلمہ کی ہے اگر ایک حرف کو مکرر کیا پس اگر اس میں کسی ضعیف حرف کا اظہار ہو گیا مثلاً من یرتد کو من یرتدد پڑھ دیا تو نماز فاسد نہ ہو گی اور اگر زیادتی حرف کی ہوئی مثلاً الحمدللہ کو تین لاموں سے پڑھا تو نماز فاسد ہو گی اور اگر کلمہ کو مکرر کیا تو اگر معنی نہ بدلے تو نماز فاسد نہ ہو گی اور اگر بدل گئے مثلاً رب رب العالمین ملک مالک یوم الدین پڑھا تو صحیح یہ ہے کہ نماز فاسد ہو گی یہ ظہیریہ میں لکھا ہے اور منجملہ ان کے آگے کے پیچھے اور پیچھے کے آگے کر دینے میں

غلطی کرنا ہے اگر ایک کلمہ کو دوسرے کلمہ سے آگے کر دیا یا پیچھے کر دیا تو اگر معنی نہ بدلے مثلاً
لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَّ شَهِيقٌ پڑھا اور شھیق کو مقدم کر دیا زَفِيرٌ تو نماز فاسد نہ ہو گی یہ خلاصہ
میں لکھا ہے اور اگر معنی بدل گئے مثلاً اِنَّ الابْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ وَّ اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ وَّ اِنَّ
الْفُجَّارَ لَفِي نَعِيمٍ پڑھا تو اکثر مشائخ کا قول ہے کہ نماز فاسد ہو جائے گی یہی صحیح ہے یہ
ظہیریہ میں لکھا ہے اور اگر دو کلموں پر مقدم کر دیا پس اگر معنی بدل جاویں مثلاً اِنَّمَا ذٰلِكُمُ
الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ فَلَا يَخَافُوْهُمْ کو اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ
فَخَافُوْهُمْ پڑھا تو نماز فاسد ہو جائے گی اور اگر معنی نہ بدلیں مثلاً يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّ
تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ وَّ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ پڑھا تو نماز فاسد نہ ہو گی اور اگر ایک حرف کو دوسرے حرف
پر مقدم کر دیا تو اگر معنی بدل گئے مثلاً عفص کے بجائے عصف کے پڑھ دیا تو نماز فاسد ہو
جائے گی اور اگر معنی نہ بدلے مثلاً غثاءً احوی سے غُثَاءً اَوْخى پڑھ دیا تو نماز فاسد نہ ہو
گی یہی مختار ہے یہ خلاصہ میں لکھا ہے اور منجملہ ان کے ایک آیت کو دوسری آیت کی جگہ ذکر کر
دینا ہے اگر آیت پر پورا وقف کر کے دوسری آیت پوری یا تھوڑی سی پڑھی تو نماز فاسد نہ ہو گی
مثلاً وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ پڑھ کر اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ پڑھ دیا۔ یا سورۃ والتین...... ھذا
البلد الامین تک پڑھی پھر وقف کیا پھر لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِي كَبَدٍ پڑھا یا اِنَّ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَ عَمِلُو الصّٰلِحَاتِ پڑھا پھر وقف کیا پھر اولٰئک هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ پڑھ دیا تو نماز
فاسد نہ ہو گی لیکن اگر وقف نہ کیا اور ملا دیا تو اگر معنی نہ بدلے مثلاً اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا
الصّٰلِحَاتِ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ کی اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحَاتِ فَلَهُمْ
جَزَاءُ الْحُسْنٰى پڑھ دیا تو نماز فاسد نہ ہو گی لیکن اگر معنی بدلے مثلاً اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ
عَمِلُوا الصّٰلِحَاتِ اُولٰئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ پڑھ دیا اور اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ
الْكِتَابِ کو خالدین فیھا تک پڑھ کر اولٰئک هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ پڑھ دیا تو تمام علماء کے
نزدیک نماز فاسد ہو گی اور یہی صحیح ہے یہ خلاصہ میں لکھا ہے۔

اور منجملہ ان کے وقف اور وصل اور ابتداء ہے جہاں ان کا موقع نہ ہو اگر ایسی جگہ
وقف کیا جہاں موقع وقف کا نہیں یا ایسی جگہ سے ابتدا کی جہاں سے ابتدا کا مقام نہیں تو اگر

معنی میں بہت کھلا ہوا تغیر نہیں ہوا مثلاً اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ پڑھ کر وقف کیا پھر اولئک هم خیر البریه سے ابتدا کی تو ہمارے علماء کا اجماع اس بات پر ہے کہ نماز فاسد نہ ہوگی یہ محیط میں لکھا ہے اور اگر ایسی جگہ وصل کیا کہ جہاں وصل کا موقع نہ تھا مثلاً اصحاب النار پر وقف نہ کیا اور اس کو اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ سے ملا دیا تو نماز فاسد نہ ہوگی لیکن وہ بہت مکروہ ہے یہ خلاصہ میں لکھا ہے اور اگر معنی میں بہت تغیر ہوگیا مثلاً شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ پڑھا اور پھر وقف کیا پھر الاھو پڑھا تو اکثر علماء کے نزدیک نماز فاسد نہ ہوگی یہ محیط میں لکھا ہے اور قاضی امام سعید نجیب ابوبکر نے کہا ہے کہ جب قرأت سے فارغ ہو اور رکوع کا ارادہ کرے تو اگر قرأت کا ختم اللہ کی تعریف پر ہوا ہے تو اللہ اکبر کا اس سے ملانا اولی ہے اور اگر اللہ کی تعریف پر ختم نہیں ہوا مثلاً اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ پڑھا تو وہاں اللہ اکبر اس سے جدا کرنا ہے (۲۴) یہ تاتار خانیہ میں لکھا ہے اور منجملہ ان کے غلطی اعراب کی ہے اگر اعراب میں ایسی غلطی کی جس سے معنی بدل نہ گئے مثلاً لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ میں تے کو پیش سے پڑھا تو نماز بالاجماع فاسد نہ ہوگی اور اگر معنی میں بہت تغیر ہوا مثلاً وَ عَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ پڑھا اور میم کو زبر اور بے کو پیش سے پڑھا یا اسی قسم کی اور غلطی کی جس کے قصد کرنے میں کفر ہو جاتا ہے تو اگر بطور خطا کے پڑھا ہے تو متقدمین کے نزدیک نماز فاسد ہو جائے گی اور متاخرین میں اختلاف ہے محمد ابن مقاتل اور ابونصر محمد بن سلام اور ابوبکر بن سعید بلخی اور فقیہ ابوجعفر ہندوانی اور ابوبکر محمد ابن الفضل اور شیخ امام زاہد شمس الائمہ حلوائی کا یہ قول ہے کہ نماز فاسد نہ ہوگی۔ متقدمین کے قول میں احتیاط زیادہ ہے اس لئے کہ اس کے ارادہ میں کفر ہو جاتا ہے اور جس کے ارادہ میں کفر ہو وہ منجملہ قرآن نہیں اور متاخرین کے قول میں آسانی زیادہ ہے اس لئے کہ اکثر آدمی ایک اعراب کو دوسرے اعراب سے تمیز نہیں کر سکتے یہ فتاویٰ قاضی خان میں لکھا ہے اور یہ اشبہ ہے یہ محیط میں لکھا ہے اور اسی پر فتویٰ ہے یہ عتابیہ میں لکھا ہے اور یہی ظہیریہ میں لکھا ہے اور منجملہ ان کے یہ ہے کہ تشدید اور مد کو ان کے مقاموں سے چھوڑ دے اگر اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں تشدید چھوڑ دی یا الحمد للہ رب العالمین میں بے کو تشدید سے نہ پڑھا تو مختار یہ ہے کہ نماز فاسد نہ ہوگی اور ہر جگہ یہی حکم

ہے مگر عامہ مشائخ کا مذہب یہ ہے کہ فاسد ہوگی اور مد چھوڑنے میں اگر معنی نہیں بدلتے مثلاً اولٰئک کو بغیر مد کے پڑھا یا اِنَّا اَعۡطَیۡنٰکَ کا مد چھوڑ دیا تو نماز فاسد نہ ہوگی اور اگر معنی بدل جائیں مثلاً اولٰئک کو بغیر مد کے پڑھا یا دعا اور نداء میں مد نہ کیا تو مختار یہ ہے کہ نماز فاسد نہ ہوگی جس طرح تشدید کے چھوڑنے میں فاسد نہ ہوتی تھی یہ خلاصہ میں لکھا ہے اور اگر وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ کَذَّبَ ذال میں تشدید کی تو بعضوں نے کہا ہے کہ نماز فاسد نہ ہوگی اور اسی پر فتویٰ ہے یہ عتابیہ میں لکھا ہے اور منجملہ ان کے ہے ادغام کو اس کے موقع سے چھوڑنا اور ایسی جگہ ادا کرنا جہاں اس کا موقع نہیں اگر ایسے موقع پر ادغام کیا جہاں کسی نے ادغام نہیں کیا ہے اور اس ادغام سے عبارت بگڑ جاتی ہے اور کلمہ کے معنی سمجھ میں نہیں آتے مثلاً قُلۡ لِّلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا سَتُغۡلَبُوۡنَ میں غین کو لام میں ادغام کیا تو نماز فاسد ہو جائے گی اور اگر ایسی جگہ ادغام کیا جہاں کسی نے ادغام نہیں کیا ہے مگر اس سے کلمہ کے معنی نہیں بدلتے اور وہی سمجھ میں آتا ہے جو بغیر ادغام کے سمجھا جاتا تھا مثلاً قُلۡ سِیۡرُوۡا پڑھا اور لام کو سین میں ادغام کر دیا تو نماز فاسد نہ ہوگی اور اگر ادغام اپنے موقع سے چھوڑ دیا مثلاً اَیۡنَمَا تَکُوۡنُوۡا یُدۡرِکۡکُّمُ الۡمَوۡتُ پڑھا اور ادغام چھوڑ دیا تو نماز فاسد نہ ہوگی اگرچہ عبارت بگڑ جائے گی یہ محیط میں لکھا ہے اور منجملہ ان کے امالہ کرنا ہے جہاں اس کا موقع نہیں اگر بسم اللہ امالہ سے پڑھی یا مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ اِمالہ سے پڑھا اور اسی طرح بے موقع اِمالہ کیا تو نماز فاسد نہ ہوگی یہ محیط میں لکھا ہے اور منجملہ ان کے وہ قرأت پڑھنا ہے جو اس قرآن میں جس کو حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جمع کیا ہے۔(۲۵) بعض مشائخ نے کہا ہے کہ اگر ایسی قرأت پڑھی جو اس مشہور قرآن میں نہیں اور اس کے معنی بھی اس سے ادا نہیں ہوتے تو اگر وہ دعا یا ثناء نہیں ہے بالاتفاق نماز فاسد ہو جائے گی اور اگر اس سے وہی معنی ادا ہوئے ہیں تو امام ابو حنیفہ اور امام محمد کے قول کے موافق نماز فاسد نہ ہوگی اور امام ابو یوسف کے نزدیک نماز فاسد ہو جائے گی اور اس مسئلہ میں ٹھیک جواب یہ ہے کہ اگر مصحف ابن مسعود وغیرہ کے قرأت پڑھی تو وہ نماز کی قرأت میں شمار نہ ہوگی لیکن اس سے نماز فاسد نہ ہوگی یہاں تک کہ اگر اس کے ساتھ مشہور قرأت میں سے بھی اس قدر پڑھ لیا جس سے نماز جائز ہو جاتی ہے تو اس سے نماز جائز ہو جائے گی یہ محیط میں لکھا ہے۔

اور منجملہ ان کے ہے کلمہ کو پورا نہ پڑھنا اگر ایک کلمہ کو تھوڑا سا پڑھا اور پورا نہ کیا یا اس سبب سے کہ سانس ٹوٹ گئی یا اس سبب سے کہ باقی کلمہ بھول گیا اور پھر یاد آیا تو پڑھ دیا مثلاً الحمدللہ پڑھنے کا ارادہ کیا اور ال کہہ کر سانس ٹوٹ گئی یا باقی بھول گیا اور پھر یاد آیا اور حمدللہ پڑھا یا باقی یاد نہ آیا مثلاً یہ قصد کیا تھا کہ الحمد اور سورۃ پڑھے پھر اس کا پڑھنا بھول گیا اور پھر پڑھنے کا ارادہ کیا اور جب ال کہا تو اس کو یہ خیال ہوا کہ میں پڑھ چکا ہوں پس چھوڑ دیا اور رکوع کر دیا یا تھوڑا سا کلمہ پڑھا اس کو چھوڑ کر دوسرا کلمہ پڑھا پس ان سب اور ایسی ہی صورتوں میں بعض مشائخ کے نزدیک نماز فاسد ہو جائے گی اور شمس الائمہ حلوانی اسی پر فتویٰ دیتے تھے اور بعض مشائخ کا یہ قول ہے کہ اگر ایسے کلمہ کو تھوڑا سا پڑھا جس کے کل پڑھنے میں نماز فاسد ہو جاتی ہے تو اس تھوڑے پڑھنے میں بھی نماز فاسد ہو جائے گی اور اگر ایسے کلمہ کو تھوڑا سا پڑھا جس کے کل پڑھنے میں نماز فاسد نہ ہوتی ہو تو تھوڑا سا پڑھنے میں بھی نماز فاسد نہ ہوگی۔ یہ ذخیرہ میں لکھا ہے جزو کلمہ کو حکم کل کلمہ کا ہے یہی صحیح ہے یہ فتاویٰ قاضی خان میں لکھا ہے اور بعض مشائخ کا یہ قول ہے کہ اگر اس جزو کلمہ کے بھی از روئے لغت کچھ معنی صحیح ہو سکتے ہوں اور فضول نہیں ہوتا اور قرآن کے معنی بھی نہیں بدلتے تو چاہئے کہ نماز فاسد نہ ہو اور اگر اس جزو کلمہ کے کچھ معنی نہیں اور فضول ہے یا فضول نہیں ہے مگر اس سے قرآن کے معنی بدل جاتے ہیں تو نماز فاسد ہو جائے گی اور اکثر مشائخ کا مذہب یہ ہے کہ نماز فاسد نہیں ہوتی اس لئے کہ یہ ایسی باتیں ہیں جن سے بچنا ممکن نہیں پس ان کا حکم اسی طرح ہو گا جیسے نماز میں کھنکارنے کا ہوتا ہے یہ ذخیرہ اور محیط میں لکھا ہے اگر کلمہ کے بعض حروف کو پست پڑھا تو صحیح یہ ہے کہ نماز فاسد نہ ہوگی اس لئے کہ ایسی صورت اکثر واقع ہو جاتی ہے یہ محیط میں لکھا ہے۔

اگر قرآن کو نماز میں راگنی سے پڑھا تو اگر کلمہ بدل جاتا ہے تو نماز فاسد ہو جائے گی اور اگر صرف مد و لین کے حرفوں میں راگنی کی تو فاسد نہ ہوگی لیکن اگر بہت کھلی ہوئی راگنی ہو گی تو نماز فاسد ہو جائے گی اور اگر نماز کے علاوہ قرآن کو راگنی سے پڑھا تو اس میں مشائخ کا اختلاف ہے اور اکثر مشائخ نے اس کو مکروہ بتایا ہے یہ خلاصہ میں لکھا ہے ابو القاسم صفار بخاری نے نقل کیا ہے کہ اگر نماز اس طرح ادا کی ہو کہ اس میں بعض وجہ جواز کی ہو اور بعض

وجہ فساد کی ہو تو احتیاطاً فساد کا حکم کریں گے لیکن قرأت کے مسئلوں میں جواز کا حکم کریں گے
اس لئے کہ اس کی غلطیوں میں تمام لوگ مبتلا ہیں یہ ظہیریہ میں لکھا ہے اور منجملہ ان کے اللہ
کے ناموں میں تانیث داخل کرنا ہے اگر کسی نے نماز میں هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا أَن يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ
فِي ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ میں یاتیھم کو تاتیھم تے سے پڑھا تو محمد بی علی بن محمد الادیب نے کہا
ہے کہ نماز فاسد ہو گی اس لئے کہ اللہ کے ناموں میں تانیث داخل کرنا جائز نہیں جس طرح
اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ اور لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ اور اسی طرح اور صفات الٰہی میں
تانیث داخل کرنا جائز نہیں اور شیخ امام ابوبکر محمد بن الفضل نے کہا ہے کہ نماز فاسد نہ ہو گی اس
لئے کہ یہ فعل غیر اللہ کا ہے بعض مشائخ نے اسی کو صحیح کہا ہے یہ محیط اور ذخیرہ میں لکھا ہے فوائد
میں ہے کہ اگر کسی نے نماز میں کھلی ہوئی خطا کی پھر لوٹا کر صحیح پڑھا تو میرے نزدیک نماز اس
کی جائز ہے اور یہی حکم ہے اعراب کی غلطی کا اور اگر کسی نے پیش کی جگہ زبر پڑھا یا زبر کی جگہ
پیش پڑھا یا پیش و زبر کی جگہ زیر پڑھا تو اس کی نماز فاسد نہ ہو گی۔ (۲۶)

امام کے حقوق

اب تک ہم نے امام کے فرائض یا اس کی ذمہ داریوں کے حوالہ سے بات کی ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ امام کو کچھ حقوق بھی حاصل ہیں یا نہیں؟

امام کے کچھ حقوق تو وہ ہیں جو اسے نمازوں اور مسجد کے سلسلہ میں حاصل ہیں اور کچھ وہ جو معاش و معیشت کے حوالے سے اس کے منصب کے لحاظ سے اسے حاصل ہیں اور جن کا پورا کرنا مقتدیوں، مسجد کمیٹی، اہل محلہ یا مقتدرہ کی ذمہ داری ہے۔

نمازوں کے اوقات کا تعین:

۱ نماز اور مسجد سے متعلق حقوق میں سے ایک حق امام کو یہ حاصل ہے کہ وہ نمازوں کے اوقات کا تعین اپنی مرضی سے کرسکتا ہے۔ ہمارے ہاں مساجد میں عموماً رواج یہ ہے کہ مساجد میں سال بھر کے لئے نمازوں کا ایک دائمی نظام الاوقات آویزاں ہوتا ہے اور اس کے مطابق الگ سے بھی کوئی چارٹ یا گھڑی نما بورڈ آویزاں رہتا ہے جس پر نمازوں کے اوقات درج ہوتے ہیں۔ مسجد کمیٹی یا امام و مؤذن میں سے کوئی موسم کی تبدیلی اور دنوں کے گھٹنے بڑھنے کے لحاظ سے اوقات نماز میں تبدیلی کا اعلان کرتے رہتے ہیں اور اس اعلان کے مطابق جو وقت مقرر ہو جائے اور بورڈ پر لکھ دیا جائے اسی کے مطابق جماعت ہوتی ہے۔ بسا اوقات یہ اعلان آس پاس کی مساجد میں اذان کے

اوقات دیکھ کر کیا جاتا ہے اور بعض مساجد میں اگر تبدیلی وقت میں ایک آدھ دن کی تاخیر ہو جائے تو نمازی ہنگامہ کھڑا کر دیتے ہیں کہ فلاں مسجد میں وقت بدل گیا ہے، اخبار میں یوں ہے ابھی تک یہاں کیوں ٹائم نہیں بدلا گیا۔ حالانکہ ابھی دو چار روز مزید گنجائش ہوتی ہے اور فوراً وقت تبدیل نہ کرنے سے کوئی قباحت بھی لازم نہیں آ رہی ہوتی۔ پھر مقرر شدہ اوقات پر جماعت کرانے کے لئے امام کو سختی سے پابند کیا جاتا ہے اور ایک آدھ منٹ کی تاخیر بھی ناقابل برداشت ہوتی ہے بلکہ اگر کوئی امام ایک ڈیڑھ منٹ تاخیر سے جماعت کرا دے تو اسے کمیٹی کی طرف سے چارج شیٹ کیا جاتا ہے اور مقتدی بھی دل کھول کر بھڑاس نکالتے ہیں۔ اس موقع پر ہمیں ایک لطیفہ یاد آ گیا۔

اوقات نماز کی پابندی پر لطیفہ:

کراچی کے کاروباری حلقہ کی ایک بڑی مسجد کے امام صاحب وقت کی اس پابندی اور ایک آدھ منٹ کی تاخیر پر ہونے والی جھک جھک سے خاصے پریشان تھے، ایک روز وہ پھر ایسے وقت میں اپنے حجرہ سے صحن مسجد میں بازو چڑھاتے ہوئے داخل ہوئے جب جماعت میں ایک منٹ باقی تھا۔ صحن میں مسجد کے متولی پہلے ہی حضرت کے منتظر تھے کہ یہ لیٹ ہوں اور وہ خبر لے۔ امام صاحب متولی کے قریب آ کر قمیص کی آستینیں اور بازو اوپر کرنے لگے تو اس نے کہا۔ کیا وضو ابھی بنانا ہے؟ امام صاحب نے کہا بتایئے کیا کروں میں خود اس مخمصے میں ہوں کہ ایک منٹ باقی رہ گیا ہے وضو بناتا ہوں تو نماز میں مزید ایک آدھ منٹ کی تاخیر ہو جائے گی، کیا خیال ہے ایسے ہی پڑھا دوں؟ متولی ذرا جھینپ سا گیا اور اس نے کہا آپ وضو بنا لیجئے اور مؤذن کو اشارہ کیا کہ ابھی اقامت نہ کہنا۔ امام صاحب نے کہا وضو تو میرا ہے میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ایسی صورت میں تم کیا کرتے ہو۔

اوقات کا تعین کس کا حق ہے؟

اس طرح کی پابندی مساجد منتظمہ کی جانب سے آئمہ پر خواہ مخواہ کا ایک جبر ہے کیونکہ جماعت کے لئے وقت کا تعین امام کا حق ہے اور اس میں تاخیر و تقدیم بھی اسی کی منشاء

پر موقوف ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں یہ گھڑیاں نہیں تھیں اور نہ اس طرح سے منٹوں اور سیکنڈوں کا تعین کر کے نمازوں کے اوقات مقرر کیے جاتے تھے۔ جب امام آ گیا جماعت کھڑی ہو گئی۔ مؤذن رسول علیہ السلام حضرت بلال رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرہ مبارک سے برآمد ہونے پر اقامت شروع کرتے تھے اور کوئی دعویٰ سے نہیں کہہ سکتا کہ ہر روز مثلاً ظہر کی نماز منٹوں سیکنڈوں کے حساب سے عین اسی وقت پر ہوتی تھی جس پر گزشتہ روز ہوئی ہے۔

میرے اپنے خیال کے مطابق گھڑیوں سے نمازوں کے اوقات کا اس طرح تعین بھی ایک بدعت ہے اور امام کو یہ حق ہے کہ وہ ایک دو منٹ کی تاخیر یا اپنے حسب حال مناسب تاخیر کر سکتا ہے، میرے اس خیال کو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی تائید حاصل ہے۔ حوالہ کا انتظار کیجئے (اگلے پیراگراف تک)

۲۔ کسی عذر کی صورت میں امام کو یہ حق ہے کہ وہ مقتدیوں کو یہ حکم دے کہ وہ اس کا انتظار کریں خواہ اس کے آنے میں کتنی ہی تاخیر ہو اور ایسی صورت میں اسے حق ہے کہ وہ چاہے تو کسی اور کو نماز پڑھانے کی ہدایت کر دے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک رات عشاء کی نماز کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتظار کرتے رہے۔ نہ جانے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر کے اندر کسی کام میں مشغول تھے یا کیا وجہ تھی۔ بہر حال آپ تہائی رات یا اس کے بھی بعد تشریف لائے۔ آتے وقت آپ نے فرمایا، تم اس نماز کا انتظار کر رہے تھے جس کا انتظار تمہارے سوا کسی اور دین کا ماننے والا نہیں کرتا۔ اگر میری امت پر دشوار نہ ہوتا تو میں اسی وقت (یعنی تاخیر سے) نماز پڑھایا کرتا۔ پھر آپ نے مؤذن کو اقامت کہنے کا حکم دیا اور نماز پڑھا دی۔ (صحیح مسلم باب وقت العشاء وتاخیر)

ایک اور روایت ہے کہ ”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آدھی رات تک عشاء کی نماز مؤخر کرنے کی پرواہ نہیں کرتے تھے اور عشاء سے پہلے سونے کو اور اس کے بعد باتیں کرنے کو ناپسند فرماتے تھے“ (صحیح مسلم)

صحیح مسلم ہی کی ایک اور روایت میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عشاء میں کبھی تاخیر کرتے اور کبھی جلدی پڑھتے اگر لوگ (جلدی) جمع ہو جاتے تو جلدی پڑھتے اور اگر لوگ دیر سے آتے تو دیر سے پڑھتے" (صحیح مسلم)

صحیح بخاری میں ایک روایت ہے، "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا نماز کی اقامت کہی گئی اور کھڑے ہو کر صفیں برابر کر لی گئیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے۔ جب اپنے مصلے پر کھڑے ہوئے تو آپ کو جنبی ہونا یاد آیا، ہم سے فرمایا کہ اپنی جگہ رہنا، پھر جا کر غسل کیا اور ہمارے پاس تشریف لائے تو آپ کے سر مبارک سے پانی ٹپک رہا تھا پس آپ نے تکبیر کہی اور ہم نے آپ کے ساتھ نماز پڑھی۔" (صحیح بخاری، ج ۱، کتاب الغسل)

صحابہ اور آج کے مشینی دور کے لوگ:

بخاری شریف کی اس روایت میں نماز کے لئے مسجد آ جانے کے بعد امام کو غسل یاد آ جانے کا ذکر ہے اور یہ بھی کہ مقتدی امام کے واپس آنے تک اپنی اپنی جگہ ٹھہرے رہیں۔ یہ صحابہ تھے جنہوں نے اپنے امام کی اس قدر اتباع کی کہ نہ کسی دوسرے کو امام بنایا نہ انتظار میں کوئی کلفت محسوس کی اور وہ ان کے امام (امام الانبیاء علیہم السلام) تھے کہ جنہوں نے عین اس موقع پر جب آپ مصلے پر پہنچ چکے تھے برملا فرما دیا ٹھہرے رہو مجھے غسل کرنا یاد آ گیا ہے۔

آج کے ہمارے اس مشینی دور میں اگر کسی امام کے ساتھ یہی صورت پیش آ جائے اور وہ مقتدیوں سے برملا یہ بات کہہ دے تو پھر دیکھئے تماشہ۔ حالانکہ امام کو اس بات کا حق ہے کہ وہ کسی عذر کی بناء پر نماز میں تاخیر کر دے جیسا کہ اس حدیث سے واضح ہے۔

زمانہ طالب علمی کا ایک لطیفہ:

ہمارے زمانہ طالب علمی میں ہمارے مدرسہ (دار العلوم نعیمیہ، کراچی) کی مسجد میں ایک طالب علم امام بنایا گیا جو انتہائی شریف اور متقی ترین طالب علم تھا۔ ایک روز اس نے نماز مغرب سے سلام پھیرنے کے بعد اعلان کیا۔ لوگو! مجھے اپنے وضو میں اس بناء پر شک ہے کہ

نماز سے قبل ناظم مدرسہ کے حکم پر ہم طالب علموں نے مل کر پتھر اٹھائے ہیں ممکن ہے وزن اٹھانے کے دوران میرا وضو ساقط ہو گیا ہو بہر کیف مجھے شک ہے آپ چاہو تو اپنی اپنی نماز لوٹا لو۔ بس اس اعلان کے ساتھ ہی مسجد میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ ایک بڑے صاحب بولے لاحول ولا قوۃ ایسے شخص کو امام بنا دیا ہے جسے اپنے وضو اور طہارت تک کا معلوم نہیں، کسی اور نے کہا یہ مدرسہ والے بڑے عجیب لوگ ہیں کوئی مستقل امام نہیں رکھتے طلباء میں سے جسے چاہتے ہیں امام بنا دیتے ہیں اور جب طلباء امام ہوں گے تو پھر ایسا ہی ہوگا۔ یہ تو تھی عوام کالانعام کی بات جنھوں نے ایک دیانتداری کا مظاہرہ کرنے والے امام کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کیا مگر اب عقل مندوں اور شریعت کا علم رکھنے والوں کی سنئے۔

اگلے روز دارالعلوم کے ٹرسٹیز کی ہنگامی میٹنگ میں یہ مسئلہ پیش ہوا اور اس وقت کے ٹرسٹ کے جنرل سیکریٹری جو ماشاء اللہ ایک جدید فکر کے مالک پروفیسر اور مفتی و عالم سمجھے جاتے ہیں نے اصرار کیا کہ اس لڑکے کو فوراً امامت سے ہٹا دیا جائے ورنہ لوگ مدرسہ سے ناراض ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس فیصلہ کے بعد اس شریف امام کو جس نے ''اللہ کی ناراضگی کے خوف سے'' برملا اعلان شک کیا تھا مدرسہ والوں نے ''لوگوں کی مدرسہ سے ناراضگی کے خوف سے'' امامت سے الگ کر دیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۝ اسی موقع کے لئے غالباً کہا گیا ہے۔

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

حضرت پیر سید مہر علی شاہ صاحبؒ مجدد گولڑہ شریف سے ایک مرتبہ کسی امام مسجد نے مقتدیوں کی عدم اطاعت اور بے ادبی کی شکایت کی۔ فرمایا ''دنیا بے عدلی اور ناحق شناسی سے پر ہو گئی ہے۔ جہاں جاؤ اور جدھر دیکھو یہی روش نظر آتی ہے۔ صبر کرو کیونکہ یہی اچھا ہے۔ روزی کا انتظام بارگاہِ علام الغیوب سے بندوں کی پیدائش سے پہلے کا کیا ہوا ہے۔ وقت گزارنا مقصود ہے خواہ آدنی روٹی پر ہو۔ ہم خود بھی لوگوں کی اذیت رسانی سے محفوظ نہیں ہیں مگر خدا کا فضل ہے کہ ہم ان کے خلاف دنیوی ذرائع سے کوئی انتقامی کارروائی نہیں کرتے بلکہ خلق کے نیک و بد کی جزا خالق پر چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ظلم کا ہاتھ ہمیشہ دراز نہیں رہتا۔''

امام کی غیبت:

مجھے ایک بار کوٹ رادھا کشن (ضلع قصور) کی ایک مسجد میں نماز فجر پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ جماعت کا وقت ہو گیا، گھڑیال نے گھنٹیاں بجا دیں۔ مگر امام صاحب ابھی نہیں آئے تھے، لوگوں نے ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا کھسر پھسر شروع ہوئی۔ ایک شخص امام صاحب کے حجرہ پر پہنچا دستک دی، امام صاحب نے اندر سے فرمایا وضو بنا رہا ہوں، سنت پڑھ کر آؤں گا پانچ سات منٹ لگیں گے، انتظار کر سکو تو کر لو ورنہ فلاں ''بابے'' کو امام بنا کر نماز پڑھ لو۔ اس شخص نے مسجد میں آ کر یہ پیغام بآواز بلند سنا کر لوگوں کی رائے طلب کی۔ بس پھر زبانیں تھیں کہ قینچیوں کی طرح امام کی غیبت و برائی میں چلنے لگیں بابے نے نماز پڑھا دی، نماز کے بعد میرا ارادہ ہوا کہ اٹھ کر مسئلہ کی وضاحت کر دوں اور حدیث بخاری ان لوگوں کو سنا دوں، مگر میں اجنبی تھا، دل میں خیال آیا جن لوگوں نے امام کی بات کا احترام و حیاء نہیں کیا وہ تمہاری بات کو کب در خور اعتناء سمجھیں گے۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہی لوگ جن کی زبانیں تھوڑی دیر پہلے مقراض کا کام کر رہی تھیں اب وہی امام سے مصافحہ کر رہے تھے کہ امام صاحب دوسری صف میں پہلی رکعت میں جماعت سے آ ملے تھے۔ مگر میرے لئے لوگوں کا یہ منافقانہ طرز عمل کوئی نئی بات نہ تھی۔

۳۔ امام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جماعت کرانے (یا مقتدیوں کی امامت) کیلئے وقت سے پہلے ہی آ کر مسجد میں بیٹھ جائے یا جماعت کے وقت سے ذرا دیر پہلے آئے یا عین وقت پر پہنچے، یہ جو بعض مساجد میں خود ساختہ دستور ہے کہ امام لازمی طور پر جماعت سے چند منٹ پہلے ہی مصلی امامت پر آ کر بیٹھے اور اقامت سے قبل وہ مصلی پر موجود ہو، یہ صحیح نہیں کیونکہ امام کے منصب کا تقاضا یہ ہے کہ مقتدی اس کا انتظار کریں نہ کہ وہ پہلے سے آ کر مقتدیوں کا انتظار کرے۔ اس پر دلیل فتاویٰ عالمگیری کی یہ عبارت ہے۔

> ''جب کوئی شخص اقامت کے وقت داخل ہو تو اس کو کھڑے ہو کر
> انتظار کرنا مکروہ ہے بلکہ بیٹھ جائے۔ پھر مؤذن جب حی علی الفلاح
> کہے تو کھڑا ہو، اگر مؤذن امام کے سوا کوئی اور ہو اور نمازی مع امام

کے مسجد کے اندر ہوں تو موذن جس وقت حی علی الفلاح کہے اس وقت ہمارے تینوں اماموں کے نزدیک امام اور نمازی کھڑے ہو جاویں اور امام مسجد میں سامنے سے آئے تو امام کو دیکھتے ہی سب کھڑے ہو جائیں۔" (فتاویٰ عالمگیری، جلد اول)

یہ سب صورتیں اقامت کے شروع ہونے اور امام و مقتدیوں کے نماز کے لئے کھڑے ہونے سے متعلق ہیں ان سے معلوم ہوا کہ امام کو اختیار ہے پہلے سے موجود ہو یا بعد کو آئے یا عین اقامت کے وقت آئے تاہم یہ بات واضح ہے کہ نماز کے لئے امام بعد میں آئے گا مقتدی پہلے سے موجود ہوں گے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہی تھا کہ آپ جب نماز پڑھانے کے لئے تشریف لانا چاہتے اور اپنے حجرہ مبارکہ کا پردہ سرکاتے تو بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ کو دیکھ کر اقامت کہنا شروع کرتے۔ اب اس سلسلہ کی احادیث کا متن و ترجمہ ملاحظہ ہو۔

صحیح مسلم کی روایت ہے:

عن ابی ھریرہ رضی اللہ عنہ ان الصلوٰۃ کانت تقام لِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَیَاْخُذُ النَّاس مصافھم قبل اَنْ یَّقُوْمَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم

(یعنی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نماز کی اقامت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے پر کہی جاتی تھی اور لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے سے پہلے اپنی صفیں درست کر لیتے تھے)

صحیح مسلم ہی کی ایک دوسری روایت ہے:

عَنْ جَابِرِ بن سَمُرَۃ قَالَ کَانَ بِلَالُ یؤذن اذا دحضت فلا یُقیم حَتّٰی یَخْرُجُ النَّبِیّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاِذَا خَرَجَ اقام الصَّلٰوۃَ حِیْنَ یَرَاہ (۱)

(یعنی حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ بلال زوال

آفتاب کے بعد اذان (ظہر کہتے) اور اقامت اس وقت تک نہیں
کہتے تھے جب تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تشریف لاتے نہ
دیکھ لیتے)۔

کنز العمال (ج ۸/ ۲۳۲۸۰) میں ایک روایت جابر بن سمرۃ کے حوالہ سے اس
طرح ملتی ہے:

كَانَ مُؤَذِّن رَسُوْلَ اللهُ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يمهل فلا يقيم
حَتّٰى اِذَا رَاٰى النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ خَرَجَ اَقَامَ
الصَّلٰوةَ حِيْنَ يَرَاهُ (۲۹)

(یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مؤذن انتظار کرتا تھا اور اس وقت
تک اقامت نہ کہتا تھا جب تک کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے
حجرہ مبارک سے نکل کر مسجد تشریف لاتے ہوئے دیکھ نہ لیتا)۔

۴۔ امام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جتنی مقدار بآسانی نماز میں قرأت کر سکتا ہو کرے اور قرآن کریم کی جو آیات اسے اچھی یاد ہوں وہ پڑھے۔ تاہم اگر اس مقدار قرأت کی رعایت کرے جو کتب فقہ وسنت میں مذکور ہے اور وہی سورتیں تلاوت کرے جن کا ذکر ہم نے گزشتہ صفحات میں کیا ہے تو افضل واولیٰ ہے۔ تاہم آئمہ کرام کو چاہیئے کہ وہ ہر روز انہی آیات کا اعادہ وتکرار نہ کریں جو انہیں اچھی یاد ہیں بلکہ مزید آیات وسور یاد کر کے نمازوں میں تلاوت کرنے کی کوشش کریں اگرچہ ہر نماز کی ہر رکعت میں صرف سورۃ اخلاص کی تلاوت سے بھی نماز جائز ہے۔

۵۔ امام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جہری نمازوں میں متوسط آواز سے قرأت کرے، بہت بلند آواز سے جسے جہر مفرط کہتے ہیں، قرأت کرنا مکروہ ہے اور امام کی ذمہ داری صرف اس قدر ہے کہ اس کے پیچھے کھڑے مقتدیوں میں سے قریبی دو تین اس کی آواز سن لیں۔ تمام صفوں اور پورے محلّہ والوں کو سنانا کچھ ضروری نہیں بلکہ اتنی بلند آواز سے قرأت کرنا جس میں مشقت ہو اور اس بناء پر جو جہر مفرط کے حکم میں ہو مکروہ ہے۔

عام نمازوں میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال:

لاؤڈ اسپیکر کا نمازوں میں استعمال اگرچہ تعامل علماء و فتاویٰ فقہاء کی بناء پر اب بلاشبہ درست ہے تاہم لاؤڈ اسپیکر کے استعمال میں اس بات کا لحاظ رہنا چاہئے کہ اس کی آواز اس قدر تیز نہ ہو کہ سننے والوں پر گراں گزرے۔ خصوصاً مسجد کے بیرونی یونٹ اور ہارن نمازوں میں تلاوت کے لئے بلاضرورت استعمال کرنے سے گریز ضروری ہے۔ لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کے جواز پر فتاویٰ نوریہ جلد اول (از فقیہ اعظم علامہ محمد نور اللہ بصیر پوری) میں نہایت عمدہ و نفیس علمی تحقیق موجود ہے اور گزشتہ صفحات میں نماز تراویح کے دوران لاؤڈ اسپیکر کے استعمال پر گفتگو کی جا چکی ہے۔

۶۔ اختتام نماز (جماعت) پر امام کو چاہئے کہ وہ اپنا رخ قبلہ کی طرف سے پھیر کر مقتدیوں کی طرف کرلے اور اس میں اسے اختیار ہے کہ دائیں جانب کو پھرے یا بائیں جانب کو۔ اسے اس بات پر مجبور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ لازماً دائیں جانب ہی کو مڑے۔ (۳۰)

۷۔ جن نمازوں میں فرائض کے بعد سنت ونوافل ہیں ان میں فرائض کے بعد صرف اتنی مقدار ٹھہرنا چاہئے جس میں آیت الکرسی پڑھی جائے اور پھر دعا مختصر ہو، یعنی

اَللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَ مِنْکَ السَّلَامُ تَبَارَکْتَ یَا ذَالْجَلَالِ وَالْاِکْرَام یا اس کے ساتھ رَبَّنَـا اٰتِنَـا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ

شامل کرے اور لمبی لمبی دعاؤں میں مشغول نہ ہو اور جن نمازوں میں فرائض کے بعد سنن نہیں ہیں، ان میں کچھ دیر ذکر اذکار و تسبیحات کے لئے بیٹھنا اور پھر دعا کرنا درست ہے۔

دعاؤں میں ریاکاری:

بعض تنظیموں، تحریکوں اور اداروں کی جانب سے بڑی راتوں میں قیام اللیل اور ''رقت انگیز دعاؤں'' میں شمولیت کی دعوت کے اشتہارات چھپتے ہیں۔ کراچی والے لاہور اور لاہور والے کراچی کا سفر کرتے ہیں کہ ''رقت انگیز دعا'' میں جانا اور شامل ہونا ہے۔

اول تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اس بڑی رات کے قیام میں دوران دعاء، دعا خوان حضرت کی دعا میں لازماً رقت پیدا ہو کر رہے گی؟ جو دعوے سے لوگوں کو ''رقت انگیز دعا'' میں شمولیت کی دعوت دی جارہی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ رقت انگیزی کی سی کیفیت بنانے کی مشق کر لی گئی ہو اور اب ہر سال لوگوں کے سامنے اس مکاری وعیاری کا مظاہرہ کرنا طے پا گیا ہو؟

کیا کبھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے صحابہ کرام یا آئمہ اہل بیت وصوفیاء کرام نے بھی یہ دعویٰ کیا کہ فلاں رات، فلاں دن یا فلاں وقت ہم پر ضرور رقت طاری ہو گی؟ اور کیا کبھی ان اکابر نے بھی اس طرح اپنے پیروکاروں اور مریدین کو جمع کیا؟ آخر یہ کس کی تقلید ہو رہی ہے؟ کون سے دین کو فروغ دیا جا رہا ہے؟ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ ٥

بعض ائمہ کو دیکھا گیا ہے وہ بہت لمبی لمبی دعائیں مانگتے ہیں اور دعا کے الفاظ میں بھی ان سے تسامح ہوتا رہتا ہے اس کا خیال رکھنا چاہئے جبکہ بعض آئمہ موقع محل کے مناسب دعا کرانے میں بڑے حریص واقع ہوئے ہیں۔ مجھے ایک بار یہ دیکھنے کا اتفاق ہوا کہ ایک امام صاحب جو مغرب کی نماز سے ذرا دیر پہلے شمالی ناظم آباد کراچی میں ہمارے ساتھ ایک میٹنگ میں شریک تھے اچانک اٹھے اور مجھے مسجد لے چلنے کو کہا، میں حضرت کو اپنی گاڑی میں سوار کر کے ان کی مسجد تک لے گیا حضرت نے نماز مغرب پڑھائی اور اس کے بعد یوم پاکستان کی مناسبت سے طویل دعا کی۔ بعد کو مؤذن سے معلوم ہوا کہ وہ اسی دعا کی خاطر ناظم آباد سے دستگیر سوسائٹی شدرحال کر کے تشریف لائے تھے اور نماز ودعا کے بعد پھر واپس ناظم آباد جا کر میٹنگ میں شریک ہوئے۔ یہ اہتمام یوم پاکستان کیلئے اس مخصوص دعا کی خاطر تھا تاکہ نمازی محظوظ ہوں اور امام کو ملک وقوم کا خیر خواہ سمجھیں۔ اللہ تعالیٰ ایسی ریاکاری سے بچائے۔ (آمین)

دعاؤں کا لب ولہجہ درست کیجئے:

بسااوقات یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ امام دعا میں جو لب ولہجہ اختیار کرتا ہے اسے دعا سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ دعا تو درخواست ہے اور درخواست عاجزی وانکساری سے پیش

کی جاتی ہے نہ کہ رعب داب اور گرج چمک کے ساتھ۔ بعض آئمہ حضرات دعا میں یوں مشغول ہوتے ہیں جیسے کسی کو ڈانٹ رہے ہوں۔ دعا میں آواز بھی پست ہونی چاہئے نہ کہ جہر مفرط کی طرح بلند اور انداز بھی عاجزانہ ہونا چاہئے۔

۸۔ نماز (فرائض) کے اختتام پر امام کو یہ حق حاصل ہے کہ سنت و نوافل اپنی قیام گاہ پر جا کر ادا کرے اور اس کا مصلائے امامت پر یا مسجد ہی میں سنت و نوافل ادا کرنا چنداں ضروری نہیں۔ ہاں اگر مقتدی نمازوں کے بعد شرعی مسائل وغیرہ دریافت کرتے ہوں تو اس کار خیر کی نیت سے ٹھہر کر سنن و نوافل مسجد میں بھی ادا کر سکتا ہے۔

سنن ابو داؤد میں روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ بنو اشہل کی مسجد میں مغرب کی نماز پڑھ کر دیکھا کہ لوگ مسجد ہی میں سنت ادا کرنے میں مشغول ہیں تو آپ نے فرمایا: ''هٰذِهٖ صَلَاةُ الْبُیُوْت'' کہ یہ گھر میں پڑھی جانے والی نماز ہے چنانچہ سنن و نوافل کا گھر پر پڑھنا افضل ہے۔ (۳۱)

بعض مساجد میں نماز جمعہ کے بعد صلاۃ وسلام پڑھنے نہ پڑھنے اور نماز پنجگانہ کے بعد دعائے ثانی، یا فراغت نماز پر امام سے مصافحہ کرنے نہ کرنے جیسے جھگڑے محض اسی وجہ سے ہوتے ہیں کہ لوگوں نے اس سنت پر عمل کرنا چھوڑ دیا اگر سب لوگ فرائض کے بعد اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں اور سنن و نوافل گھروں میں جا کر ادا کریں تو اس طرح کے کئی مسائل از خود حل ہو جائیں۔

مجموعی طور پر امام کیسا ہو؟

مجموعی طور پر ایک امام یا خطیب کیسا ہو یہ سوال انتہائی اہم ہے مگر اس کا جواب وہ نہیں جو فوراً ذہن میں آئے اور ہر کہ و مہ امام و خطیب کا معیار مقرر کرنے بیٹھ جائے۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ اب ہر شخص اپنے ذہن میں ایک امام رکھتا ہے اور اس نے ایک خود ساختہ معیار اپنے ذہن میں بٹھا لیا ہے، جہاں کوئی امام اس معیار سے مختلف ہوا وہیں اس کی نماز چھٹی اور وہ مسجد سے غائب ہوا۔ بلکہ زیادہ افسوسناک بات تو یہ ہے کہ جو بھی مسجد کا رخ

نہیں کرتے اور جنہیں وضو کے فرائض اور استنجاء وغسل کا طریقہ نہیں معلوم وہ بھی اپنے ذہن میں امام وخطیب یا بالفاظ عوام ''مولوی'' کا ایک معیار رکھتے ہیں۔ فتاویٰ رضویہ میں ہے:

آج کل لوگوں کے نزدیک عالم ہونے کے کئی معیار ہیں۔ بعض لوگوں کے نزدیک عالم ہونے کا معیار ہے تعویذ لکھنا اور جھاڑ پھونک کرنا۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ کیسا عالم ہے کہ جو نہ تعویذ لکھتا ہو اور نہ جھاڑ پھونک کرتا ہو۔ یعنی ان کے نزدیک حقیقت میں عالم وہی شخص ہے جو یہ سب کام کرتا ہو۔

اور کچھ لوگوں کے نزدیک عالم ہونے کا معیار ہے، تقریر میں جادو بیانی، لہذا جو لوگ جادو بیان مقرر نہیں ہیں، ان لوگوں کے نزدیک حقیقت میں وہ عالم ہی نہیں ہیں اور بعض لوگوں کے نزدیک عالم صرف وہی ہیں جو فلسفہ اور منطق کے ماہر ہیں۔

اور کچھ لوگوں کے نزدیک حقیقت میں عالم وہ شخص ہے جو جھوٹے کاغذات بنا کر زیادہ سے زیادہ گورنمنٹ سے روپیہ حاصل کرنے کا فن جانتا ہو۔ مدارسِ عربیہ کے دینی ماحول کو دنیاداری کے سانچے میں ڈھالنے کی مہارت رکھتا ہو، خوب جھوٹ بولتا بھی ہو اور دوسروں کو جھوٹ سکھاتا بھی ہو۔ حلال وحرام اور جائز وناجائز میں کوئی امتیاز نہ رکھتا ہو، حکام وغیرہ کو رشوت دینے میں مہارت رکھتا ہو اور گورنمنٹ کے آفسوں میں چکر کاٹنے پر کوئی غیرت نہ محسوس کرتا ہو۔ تو وہ لوگ ایسے شخص کو بڑے بڑے القابوں سے یاد کرتے ہیں اور اس کو سب سے بڑا عالم سمجھتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت میں سب سے بڑا عالم وہ شخص ہے جو سب سے زیادہ مسائل شرعیہ جانتا ہو اور باعمل بھی ہو۔ (فتاویٰ رضویہ)

ملامتی فرقہ:

دارالعلوم کراچی کے بانی مبانی مفتی محمد شفیع صاحب کی ایک تحریر میری نظر سے گزری۔ جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ ''مولوی بے چارہ ملامتی فرقہ ہے، جب کہیں دنیا میں کوئی خرابی ہوگی لوگ کسی نہ کسی طرح اس خرابی کو مولوی کے سر منڈھنے کی کوشش کریں گے۔ مولوی جو کام بھی کرے اس میں کوئی نہ کوئی اعتراض، کوئی نہ کوئی شبہ، کوئی نہ کوئی طعنہ نکالنے

کی ضرور کوشش کرتے ہیں، مولوی بے چارہ اگر گوشہ نشین ہو اور بیٹھ کر اللہ اللہ کر رہا ہو یا قال اللہ و قال الرسول میں لگا ہوا ہو۔ گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کئے ہوئے ہو تو اعتراض یہ ہے کہ مولوی تو دنیا سے بے خبر ہے دنیا کہاں جا رہی ہے اور ان کو بسم اللہ کے گنبد سے نکلنے کی فرصت نہیں۔ اگر مولوی بے چارہ گوشہ سے نکل کر کسی کام کے لئے یا اصلاح کے لئے باہر نکل آئے تو اعتراض ہے کہ دیکھئے صاحب، یہ مولوی صاحب ہیں ان کو چاہئے تھا کہ یہ مدرسہ اور مسجد میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرتے انہوں نے سیاست اور حکومت کے معاملات میں دخل اندازی شروع کر دی، اس سے ان کا کیا تعلق؟ اگر مولوی بے چارے کے پاس مالی وسائل کا فقدان ہو اور فقر و فاقہ کا شکار ہو تو اعتراض دیکھئے یہ مولوی صاحب ہیں، علماء کرام ہیں، دنیا کس طرف جا رہی ہے اور انہوں نے دینی مدارس میں کوئی معقول انتظام نہیں کیا۔ ان کے مدارس کے پاس مالی وسائل ہوتے، معاش کے ذرائع حاصل کرنے کی سہولت ہوتی، اب یہ اور ان کے طلباء پڑھ کر کہاں جائیں گے؟ کیا کریں گے؟ کیسے ان کا گزارہ ہوگا۔

اگر مولوی یا عالم کے پاس چار پیسے زیادہ آ گئے تو اعتراض، کہ لیجئے صاحب، مولوی صاحب ہیں عالم دین ہیں لکھ پتی اور کروڑ پتی بنے ہوئے دنیا دار ہیں۔ بھلا علماء کرام کا مال اور دنیا سے کیا تعلق۔

غرض اس بے چارے مولوی کی کسی حالت میں معافی نہیں، ہر حالت میں اس پر اعتراض اور طعنہ ضرور ہوگا۔ کچھ لوگ تو وہ ہیں جو باقاعدہ اہتمام کے ساتھ پروپیگنڈہ کر کے عناد کے طور پر علماء کرام، اہل علم اور طلبہ علوم دین کے لئے بدگمانیاں اور بدظنیاں پھیلانا چاہتے ہیں۔" (۳۲)

اس وقت صورت حال اور بھی عجیب اور تشویشناک ہے۔ ایک طرف تو تقاضا یہ ہے کہ امام خوب پڑھا لکھا ہو اور دینی علوم کے ساتھ ساتھ وہ عصری علوم پر بھی دسترس رکھتا ہو، اسے ملکی، قومی بلکہ بین الاقوامی صورتحال کا بھی علم ہو اور کرنٹ افیئرز (Current Affairs) حالات حاضرہ و امور تازہ پر بھی اس کی نظر ہو، مگر دوسری طرف صورت یہ ہے کہ اگر کسی عالم کے بچے اسکول یا انگلش میڈیم میں زیر تعلیم ہوں تو اعتراض ہے کہ لیجئے صاحب

مولوی صاحب نے اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم پہ لگا رکھا ہے اور ہمیں کہتے ہیں کہ بچوں کو قرآن کا حافظ اور عالم بناؤ، اور اگر امام صاحب کے بچے اسکول نہ جاتے ہوں صرف قرآن حفظ کرنے اور دینی تعلیم میں مشغول ہوں تو اعتراض کہ امام صاحب زمانہ ترقی کر چکا ہے اب دنیاوی تعلیم بھی ضروری ہے آپ اپنے بچوں کو اسکول کیوں نہیں بھیجتے۔

امام اگر کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کر لے تو اعتراض کہ لیجئے صاحب پرانے زمانے کے علماء بڑے قناعت پسند اور متوکل علی اللہ ہوتے تھے اپنے کام سے کام اور دینی خدمت سے سروکار رکھتے تھے انہیں کاروبار چمکانے کی پڑی ہے اور اگر امام کی مالی حالت خستہ ہونے کی بناء پر وہ لوگوں سے کبھی قرض مانگ بیٹھے یا کسی آفت میں مدد کا خواستگار ہو تو اعتراض کہ صاحب دیکھو لوگوں سے اپنی ضروریات کا رونا روتے رہتے ہیں اس سے اچھا تو یہ ہے کہ یہ امامت کے ساتھ ساتھ کوئی اور کام بھی کرتے تاکہ ان کی معاشی ضروریات دوسری مد سے پوری ہوتی رہتیں۔ علی ھذا القیاس، کوئی پہلو اور کوئی گوشہ زندگی ایسا نہیں جس میں امام پر طعن و تشنیع اور اعتراض نہ ہو۔ غرضیکہ فی زمانہ امام کو اپنی عزت نفس اور سفید پوشی کا بھرم قائم رکھتے ہوئے کہیں جم کر امامت و خطابت کا فریضہ انجام دینا از حد دشوار ہو چکا ہے۔

امام کا ذریعہ معاش:

علمائے سلف کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنے معاشی معاملات میں عوام کے دست نگر رہنے کو ناپسند کرتے تھے۔ چنانچہ وہ کوئی نہ کوئی کاروبار ملازمت یا صنعت گری کا سلسلہ رکھتے تھے۔ اکثر علماء کا رجحان تجارت کی طرف رہا ایسے بھی ہوئے جنہوں نے طبابت، کتابت اور صنعت و حرفت کو اپنایا۔ ذیل میں ہم بعض علماء کے اسمائے گرامی اور ان کے پیشے یا ذرائع روزگار کا ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ حضرت سالم بن عبداللہ تجارت کرتے تھے اور عام بازار میں جا کر خرید و فروخت کرتے (دیکھئے تذکرۃ الحفاظ، ج ۱، ص ۷۷)

۲۔ حضرت ابو صالح سمان، روغن زیتون (زرد) کی خرید و فروخت کرتے تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ، ج ۱، ص ۷۸)

۳۔ امام یونس بن عبید، ریشمی کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ، ج ۱، ص ۱۳۰)

۴۔ حضرت داؤد بن ابی ہند، بھی ریشمی کپڑے کے تاجر تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ، ج ۱، ص ۱۳۰)

۵۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ، کپڑے کے تاجر تھے کوفہ میں آپ کی ایک بڑی دکان تھی اور آپ کے ملازمین ملک کے مختلف حصوں میں سامان تجارت لے کر جاتے یا ادھر سے خرید کر یہاں لاتے تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ، ج ۱، ص ۱۵۱)

۶۔ حضرت عبداللہ ابن مبارک، وہ جید عالم کہ جن کے استقبال کو لوگوں کا اس قدر ہجوم ہوتا تھا کہ گویا افق پر غبار چھا گیا ہو ایسے عظیم محدث کہ ایک بار خلیفہ ہارون الرشید مع لشکر شہر رقہ میں اترا ہوا تھا، اتفاق سے اسی موقع پر حضرت عبداللہ کا بھی اس شہر سے گزر ہوا۔ خراسان کے اس عظیم محدث کے استقبال کے لئے اس قدر لوگ جمع ہوئے کہ بھیڑ بھاڑ میں لوگوں کی جوتیاں پاؤں سے نکل گئیں اور کپڑے پھٹ گئے، حرم سرائے خلافت کے چوبی برج سے خلیفہ کی ایک کنیز نے یہ سارا منظر دیکھ کر حیرت زدہ ہو کر پوچھا آخر یہ ہجوم کیوں ہے بتایا گیا کہ لوگ عبداللہ بن مبارک سے ملنے جمع ہوئے ہیں۔ کنیز نے بے ساختہ کہا بخدا حکومت اس کو کہتے ہیں جو اس طرح دلوں پر کی جائے نہ کہ ہارون کی طرح کہ جس کے لئے لوگ سرکاری اہل کاروں کے زور اور دباؤ سے جمع ہوتے ہیں'' یہ بزرگ یعنی حضرت عبداللہ بن مبارک بھی وقت کے عظیم محدث ہونے کے ساتھ ساتھ مشہور تاجر بھی تھے امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ کی جلد ۱، ص ۱۳۵ پر لکھا ہے۔ ''الامام التاجر''

۷۔ مشہور حافظ حدیث غندر بصری، سوتی کپڑے اور چادروں کا بیوپار کرتے تھے۔
(تذکرۃ الحفاظ، ج ۱، ص ۲۷۵)

۸۔ امام بخاری کے استاذ حسن بن ربیع کوفی، بوریے بیچتے تھے اسی وجہ سے بعض لوگوں نے ان کا لقب بواری لکھا ہے یعنی بوریہ فروش تاجر۔ (تذکرۃ الحفاظ، ج ۲، ص ۴۴)

۹۔ امام ابوالحسن نیشاپوری، بھی بوریے کے تاجر تھے۔

۱۰۔ حضرت ہشام دستوائی، کپڑے کے تاجر تھے، دستواز، اہواز عراق کا ایک علاقہ تھا جہاں سے یہ کپڑا لا کر فروخت کرتے تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ، ج ۴، ص ۱۴۷)

۱۱۔ علامہ عبدالرحمٰن ابن الجوزی کا گھرانہ تانبے کی تجارت کرتا تھا اسی لئے کبھی کبھی آپ کے نام کے ساتھ زائد صفار بھی لکھا ہوا ملتا ہے، آپ خود بھی اپنے نام کے ساتھ کبھی کبھی صفار لکھتے تھے علاوہ ازیں جبہ فروشی کا کام بھی کیا۔ (تذکرۃ الحفاظ، ج ۴، ص ۱۳۷)

۱۲۔ حافظ الحدیث ابن مردویہ، علم نباتات کے ماہر تھے اور اس میں ان کی شہرت تھی۔

(تذکرۃ الحفاظ، ج ۴، ص ۲۱۷)

۱۳۔ ابوالفضل منبوس دمشقی، بڑھئی کے کام میں مشہور تھے۔ حتیٰ کہ شہر کے شاہی شفا خانہ کے مرکزی دروازے اور دیگر بہت سے کام انہی کے ہاتھ سے انجام پائے۔ جامع مسجد دمشق کی گھڑیاں انہوں نے درست کیں اور ان کی دیکھ بھال کرنے پر ان کو باقاعدہ تنخواہ ملتی تھی۔ (تذکرۃ الحفاظ، ج ۴، ص ۱۴۰)

۱۴۔ علامہ ابن طاہر، بہترین کاتب تھے، صحیح بخاری و مسلم اور ابوداؤد کی سات سات بار اور سنن ابن ماجہ کی دس بار اجرت پر کتابت کی۔ (تذکرۃ الحفاظ، ج ۳، ص ۳۷۱)

۱۵۔ ابوسعید نحوی، دس ورق روزانہ کتابت کرتے تھے اور اس سے فارغ ہو کر عدالت قضاء میں اجلاس کرتے۔ گزر بسر کتابت سے ہوتی تھی۔ (نزہت الالباء، ص ۳۸)

۱۶۔ نامور طبیب ابن الہیثم، کتابت کرتے تھے سال بھر میں تین کتابیں لکھ کر ان کی اجرت ڈیڑھ سو اشرفی لیتے اور انہیں سے گزر بسر کرتے تھے۔

ان کے علاوہ بھی متعدد علماء، فقہاء، محدثین و ماہرین علوم اسلامیہ ایسے گزرے ہیں جن کا ذریعہ معاش کوئی نہ کوئی شغل رہا۔

ملازمت سے وابستہ ہونے والوں میں ایسے بھی تھے جو وزیر کے اعلیٰ درجہ تک پہنچے وہ وزیر جسے آج کل کے وزیراعظم کے منصب سے بھی زیادہ احترام و وقار حاصل تھا۔ مثلاً

۱۔ امام ابوالفضل ابن خزابہ بغدادی جو حافظ الحدیث تھے اور جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ''کان من الحفاظ الثقات'' امام دار قطنی نے جن سے روایت حدیث کی ہے وہ اپنے دور میں والی مصر ملک کافور کے وزیر تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ، ج ۳، ص ۲۲۶)

۲۔ امام ابن حزم، مشہور محدث بھی وزیر ہوئے اور خلیفہ مستظہر باللہ کے وزیر رہے۔

(تذکرۃ الحفاظ، ج ۳، ص ۳۲۴)

۳۔ کمال الدین، فقہ شافعی کے معتبر عالم دین تھے اور سلطان نور الدین زنگی کے وزیر تھے۔

(ابن خلکان، ج ۱، ص ۴۷۲)

۴۔ علامہ تاج الدین ابراہیم، سلطان بایزید یلدرم کے وزیر رہے۔ (شقاق نعمانیہ، ج ۱، ص ۲۳۱)

۵۔ امام اوزاعی کے استاذ امام اسماعیل، خلیفہ منصور کے خزینہ الثیاب (کپڑوں کے گودام) کے انچارج تھے۔

۶۔ امام شعبی، اموی خلفاء کے دور میں سفارت کاری کیلئے منتخب کیے گئے اور قیصر کے دربار میں سفیر بن کر پہنچے جو آپ کی ذہانت و علم سے ازحد متاثر ہوا۔ (تذکرۃ الحفاظ، ج ۱، ص ۷۲)

۷۔ حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی، دیوان عزیز دربار بغداد کے سفیر ہوئے۔

(ابن خلکان، ج ۱، ص ۲۵۱)

۸۔ امام ابوالمحاسن قرشی، امام ابو یعقوب شیرازی، کمال الدین شافعی، علامہ قرشجی اور دیگر بہت سے علماء مختلف اوقات میں دربار شاہی کے سفیر بنائے گئے۔ اس کے علاوہ بہت سے علماء کرام نے منصب قضاء و ولایت بھی اختیار کیا، قاضی ابو یوسف جو امام اعظم کے شاگرد رشید ہیں قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) رہے۔

مگر آج کیفیت دوسری ہے۔ اگر کوئی عالم سرکار سے وظیفہ پائے تو عوام کی نظر میں مطعون، اور ایوان اقتدار سے گریزاں ہو تو زیر عتاب۔ اس طرح علماء کرام کا حال بھی عجیب ہے کہ کچھ تو صاحب علم ہونے کے باوصف مناصب سے گریزاں ہیں اور کچھ خالی جبہ و دستار کے وزن پر مسند اقتدار کے حصول میں کوشاں۔ بہرکیف، علماء و آئمہ حضرات کا ذریعہ معاش کے سلسلہ میں خودکفیل ہونا، منصب علم و امامت کے وقار میں اضافہ کا موجب ہے بشرطیکہ اختیار کردہ ذریعہ معاش بھی جائز اور باوقار ہو۔

امام کی آمدن (Income) :

معاشرہ میں پائی جانے والی بہت سی برائیوں میں سے ایک ''حسد'' بھی ہے اگر کسی مسجد کا امام یا خطیب اپنی کوشش محنت اور جان سوزی سے کاروبار میں ترقی کر لے اور اس

کے اثرات اس کی معاشرتی زندگی میں نمایاں ہوں تو بہت سے لوگوں کو امام یا عالم کی یہ آسودہ حالی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ امام یا عالم کے پاس گاڑی آ جائے یا اس کی رہائش گاہ ذاتی اور خوب صورت بن جائے تو یہ بھی بہت سے لوگوں کو کھلتی ہے اور اس پر اس قسم کے تبصرے سننے کو ملتے ہیں اجی صاحب پرانے زمانے کے علماء سادگی پسند تھے، مسجد کے حجرے میں گزارہ کر لیتے تھے اور میلوں پیدل چل کر علم کی ترویج اور دین کی تبلیغ فرماتے تھے۔ آج کل کے علماء کاروں اور کوٹھیوں کے چکر میں اور مال سمیٹنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اس طرح کی گفتگو غالباً علمائے سلف کے احوال سے بے خبری کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ غور فرمایئے گزشتہ صفحات میں علماء کے ذرائع معاش کے حوالہ سے جن علماء کرام کے اسمائے گرامی اور ان کے جن مناصب و مشاغل تجارت کا ذکر ہوا وہ اس تصور پر کس حد تک پورے اترتے ہیں جو آج بیان کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں بہت سے علماء کرام کی آمدن کا ذکر متعدد کتب میں مذکور ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علماء کرام میں متمول قسم کے علماء بھی تھے۔ مثلاً امام لیث مصری کی سالانہ آمدن اس زمانے میں اسی ہزار (۸۰۰۰۰) اشرفیاں سالانہ تھی۔ امام وعلج بغدادی جو امام دار قطنی محدث کے استاذ ہیں ان کی سرکار سے مکہ مکرمہ عراق اور سجستان کے علماء حدیث کو وظیفہ ملتا تھا۔ مکہ مکرمہ میں ان کا ایک مکان تھا جسے دار العباس کہا جاتا تھا اس کی مالیت تیس ہزار اشرفی تھی اور جب انہوں نے وفات پائی تو معز الدولہ نے ان کے ترکہ میں سے تین لاکھ اشرفیاں بحق سرکار ضبط کر لیں۔ (تذکرۃ الحفاظ، ج ۳، ص ۹۸)

ذہبی نے امام ابو الہیثم کی نسبت لکھا ہے کہ بہت مالدار تھے۔ تین یا چار بار تو انہوں نے اپنے ہم وزن چاندی خیرات کی تھی۔ (تذکرۃ الحفاظ، ج ۱، ص ۲۳۶)

حافظ رئیس ابن ابی ذیل ہروی کی سالانہ آمدن اس قدر تھی کہ صرف عشر کی مد میں سالانہ ایک ہزار خروار غلہ ادا کرتے تھے۔ امام ذہبی نے ان کے بارے میں لکھا ہے ''کان کثیر الاموال'' یعنی بہت مالدار تھے۔

مشارق الانوار کے مصنف امام حسن صغانی اپنے دور کے انتہائی متمول عالم تھے۔
شیخ ابو حامد اسفرائنی کے بارے میں ابن خلکان نے لکھا ہے کہ دنیا و دین کی ریاست کے اعتبار

سے بغداد بھر میں ممتاز تھے۔ امام بخاری اور ترمذی کے استاذ شیخ ابن سلام ہروی سرکار سے معقول وظیفہ پاتے تھے۔

مگر ہمارے دور میں امام وخطیب کے لئے ضروری قرار پایا ہے کہ وہ مسجد کی تنخواہ اور محلہ کے مردوں کی روحوں کو ایصال ثواب کی خاطر دیئے جانے والے کھانے پر گزر بسر کر کے اپنی سادگی اور قناعت کی مثال قائم کرے۔ کس قدر ظلم اور ناانصافی ہے کہ وہ بچہ جس کے والدین نے ناز ونعم کے ساتھ اسے پالا پوسا پڑھایا اور ڈاکٹر بنایا۔ وہ تو ڈگری پاتے ہی کلینک کھول کر لوگوں کو دونوں ہاتھوں لوٹنا شروع کر دے اور اس کے اہل خانہ اس پر خوش ہوں اور هَلْ مِنْ مَّزِيْد کے امیدوار ہوں اور اس کا مال کمانے کے سلسلہ میں ہر عمل وہر حربہ جائز ہو اور معاشرہ بھی اسے ایک معزز مقام دینے کو تیار ہو مگر ایک وہ بچہ جس نے غربت وافلاس کے عالم میں مدرسہ میں تعلیم پائی ہو اور مدرسہ کی روکھی سوکھی کھا کر اور اموال صدقات وزکوۃ پر گزارہ کیا اور اپنی جوانی گلائی ہو وہ جب کسی محلہ کا امام ہو جائے اور پھر امامت کے ساتھ ساتھ وہ کوئی کاروبار یا جائز ذریعہ معاش اختیار کر لے تو وہ لوگوں کی نظروں میں کھٹکنے لگے۔

ایسی کئی مثالیں ہمارے سامنے ہیں کہ جن میں امام، خطیب یا مدرس مدرسہ کو محض اس لئے فارغ کر دیا گیا کہ اس نے کوئی سائیڈ بزنس کر کے اپنی معاشی حالت اہل محلہ جیسی یا ان سے بہتر بنائی تھی۔ فیڈرل بی ایریا کراچی کی ایک دینی درسگاہ سے ناظم دارالاقامہ (ہوسٹل وارڈن) کو محض اس لئے فارغ کر دیا گیا کہ اس نے رات دن محنت کر کے اور ٹیوشن وغیرہ پڑھا کر کچھ پس انداز کیا اور گلشن اقبال میں ایک پلاٹ خرید لیا تھا۔

امام وخطیب کی رہائش گاہ:

امام وخطیب یا مسجد کے خادم کی رہائش گاہ کا معاملہ بھی خاصا دلچسپ ہے۔ لاہور، کراچی اور اسلام آباد جیسے بڑے اور مرکزی شہروں میں بڑی عالی شان مساجد بنی اور تعمیر ہو رہی ہیں مگر اکثر مقامات پر امام وخطیب کے لئے چٹائیوں کا مکان یا اسٹور والا کمرہ بطور حجرہ مقرر ہے جس کمرہ میں چٹائیاں اور دریاں رکھی جائیں گی۔ اسی میں لاؤڈ اسپیکر، جھاڑو اور میت کی چارپائی ہوگی اور اسی میں امام کو رہنا ہوگا۔

آج بھی ان بڑے شہروں میں ایسی مساجد کی کمی نہیں جن کے فرش سنگ مرمر کے اور دیواریں سنگ اخضر و احمر کی ہیں، چھتوں میں نگینے جڑے ہیں، قیمتی فانوس لٹکے اور بیش قیمت قالین بچھے ہیں۔ وضو خانوں کی ایک ایک ٹونٹی (Tap) سو دو سو روپے سے کم کی نہیں، مگر امام وخطیب کی رہائش گاہ پر ٹین یا سیمنٹ کی چادروں کی چھت ہے اور رہائش گاہ بھی ایسی تنگ وتاریک کہ الامان والحفیظ۔ لاہور میں ایک عالم کی رہائش گاہ میں چند گھنٹے ٹھہرنے کا اتفاق ہوا تو بے ساختہ ہماری زبان سے نکل گیا مولانا یہ تو ''اوپر نیچے سے گرم ہے'' فرمایا ہاں اس کے نیچے تنور ہیں اور اوپر سورج اور ہم نے تحقیق کی تو واقعی وہ مکان تنوروں والے ہال کے اوپر تعمیر کیا گیا تھا۔

ایک اور امام صاحب کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا دروازے پر لکھا تھا ''سر سنبھالئے'' معلوم ہوا کہ اوپر کی ڈاٹ اس قدر نیچے ہے کہ ہر آنے والے کا سر اس سے ٹکرا جاتا ہے، مسجد والوں نے ڈاٹ توڑ کر دروازہ اونچا کرنے کی بجائے دو لفظ لکھوانے میں اپنی مہارت دکھائی۔ کراچی میں بکرا پیڑی کے ایک مدرسہ میں ایک بار جانے کا اتفاق ہوا تو سیڑھیوں پر یہ عبارت درج تھی ''ذرا سنبھل کر'' ہم نے دعوت دینے والوں سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے تو بتایا گیا کہ سیڑھیاں بالکل کھڑی ہیں اور چکنی بھی، کچھ ٹوٹ چکی ہیں، اس لئے احتیاط کی ضرورت ہے۔ کھانے پر بیٹھے تو مسجد کمیٹی کے اراکین بھی شریک تھے ایک نے بڑے فخریہ انداز میں کہا حضرت یہاں بڑے بڑے لوگ گر چکے ہیں۔ علامہ نورانی و نیازی کے قدم بھی یہاں آ کے ڈگمگا گئے۔ ہم نے کہا خوب گویا یہ اس مسجد کمیٹی کا کمال ہے۔

ایک امام صاحب کو دیکھا برابر والے گھر سے پانی بھر کر لا رہے ہیں۔ ہم نے سبب دریافت کیا تو بتایا گیا کہ ان کی رہائش گاہ میں پینے کے پانی کا کوئی انتظام نہیں۔

یہ سب مسائل و معاملات شہری اور بڑے شہروں کی مساجد کے ہیں۔ دیہات کے علماء و آئمہ کے مسائل پر تو ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔

ہمارے ایک دوست نے بتایا کہ کراچی کے ایک پوش ایریا میں ایک امام صاحب نے نماز جمعہ کے اجتماع میں اپنے ذاتی مکان کی تعمیر کے سلسلہ میں چندہ وتعاون کی اپیل کی

کچھ نے چندہ بھی دیا مگر نمازیوں نے مسجد سے نکلتے ہوئے اس پر جو تبصرے کئے وہ ناقابل اشاعت ہیں۔

امام اور دیگر مراعات:

سرکاری وغیر سرکاری اداروں میں ملازمین کی مراعات سے متعلق کچھ نہ کچھ اصول مقرر اور طے شدہ ہوتے ہیں۔ مثلاً دوران ملازمت، ملازم اور اس کے بیوی بچوں کے علاج معالجہ کی سہولت یا میڈیکل الاؤنس، ہاؤس رینٹ، کنوینس، انشورنس، ٹیلی فون، کوالیفکیشن الاؤنس اور دیگر الاؤنسز۔ گاڑی خریدنے کے لئے لون Loan اور پھر اس کا الاؤنس اسی طرح ذاتی مکان بنانے کیلئے Loan۔

علاوہ ازیں پینشن، گریجویٹی، جی پی فنڈ وغیرہ کی مراعات اور انتقال کی صورت میں بیوی یا بچوں کے لئے پینشن۔ جبکہ مساجد میں اس طرح کی مراعات صرف سرکاری سطح پر حاصل ہیں اور وہ بھی نہ ہونے کے برابر۔ جبکہ پرائیویٹ سیکٹر میں جس میں مساجد زیادہ ہیں اس طرح کی کسی سہولت کا کوئی ذکر نہیں اور اس پر طرہ یہ کہ اگر کسی بھی سبب سے امام یا خطیب کو مسجد سے فارغ کر دیا جائے تو حکم ہوتا ہے کہ تین دن کے اندر اندر اپنا بندوبست کر لیں اور مکان بھی خالی کر دیں۔

کیا اس طرح کے احکامات جاری کرنے والے خود بھی اسی قسم کے احکامات سننے اور برداشت کرنے کو تیار ہیں؟ کیا سرکاری سطح پر تبادلوں یا اختتام سروس کی صورت میں اس طرح کے احکامات کو کوئی بھی شخص قبول کرنے کو تیار ہے؟ امام کے انتقال کی صورت میں اس کے بچوں کے لئے کوئی پینشن، گریجویٹی یا بچوں کی کفالت کا نظام نہیں۔

تم ہی کہہ دو یہی آئین وفاداری ہے؟

کہ جس کے پیچھے اتنا عرصہ نماز ادا کیں اس کے لئے کوئی مراعات نہیں اور بوقت اخراج اس قسم کا سلوک کہ کوئی مالک مکان اپنے کرایہ دار سے تو کر کے دیکھے؟

ضرورت ہے:

کراچی کی ایک مسجد کمیٹی نے امام کے تقرر کے لئے ایک شرائط نامہ شائع کیا ہے جو امامت کے منصب کے لئے انٹرویو دینے کی خاطر آنے والے ہر امیدوار کو دیا جاتا ہے، اس مسجد میں سال میں چار پانچ مرتبہ امام تبدیل کیا جاتا ہے۔ عرصہ تیس سال میں کمیٹی کو کوئی ایسا شخص نہیں ملا جو اس مسجد کے مستقل امام کے طور پر خدمت انجام دینے کے قابل ہو، لہٰذا یہاں یہ پوسٹ ہمیشہ خالی ہی رہتی ہے۔ آپ بھی درخواست دیجئے ممکن ہے آپ ان کے معیار پر پورے اتر آئیں۔ شرائط من وعن (مع اغلاط) درج کئے جاتے ہیں۔

شرائط:

۱۔ سنی بریلوی، شریعت کا مکمل پابند، قاری، درسِ نظامی سے فارغ عالم دین، پنج وقتہ نماز بمع جمعہ وعیدین مسجد غوثیہ میں پڑھانے کا پابند ہونے کے علاوہ، ایامِ بزرگانِ دین کے موقع پر بعد نمازِ عشاء خصوصی خطاب کرنے کا اہتمام کرے گا۔

۲۔ مسلکِ اہل سنت حنفی بریلوی کی ترویج واشاعت میں سرگرم عمل رہے گا۔

۳۔ لوگوں کے دینی مسائل حل کرنے میں مسجد کے حجرے میں پابند ہو کر بیٹھے گا۔

۴۔ کسی بڑے دینی و اشتراکی سماجی پروگرام کرنے میں مسجد کمیٹی سے پیشگی اجازت و مشاورت کرتا رہے گا اور خود ہر پروگرام کے انتظام میں ذمہ داری سے کام کرے گا۔

۵۔ امام صاحب مسجد کمیٹی کے پاس اپنی اصل اسناد اور اصل شناختی کارڈ مستقل طور پر جمع کرانے کا پابند ہوگا۔ فوٹو کاپیاں نہیں چلیں گی۔

۶۔ کسی ایک دن کی رخصت کے لئے بھی کمیٹی سے پیشگی اجازت لینا ہوگی۔ کمیٹی سے کوئی شکایت ہو تو بعد نمازِ عشاء تحریری درخواست دینا ہوگی۔

۷۔ مسجد کے معاملات میں امام کو کسی قسم کی مداخلت کی اجازت نہ ہوگی۔

۸۔ ہر ماہ تنخواہ کی وصولی واؤچر پر کرے گا اور چھٹیوں کی تنخواہ کاٹی جائے گی۔

۹۔ سال میں چودہ یوم کی چھٹی کا امام کو حق ہے خواہ اکٹھی لے لے یا ایک ایک کرکے۔ اس کے علاوہ کسی قسم کی چھٹی کی اجازت نہیں۔

۱۰۔ مسجد کمیٹی، امام کو میڈیکل الاؤنس، مہنگائی الاؤنس، اعلیٰ تعلیم کا الاؤنس اور دیگر کسی قسم کا الاؤنس نہیں دے گی، نہ گریجویٹی یا پنشن دینے کی پابند ہوگی۔

۱۱۔ امام کے انتقال کی صورت میں ایک ہفتہ کے اندر امام کے بچوں کو مکان خالی کرنا ہوگا۔

۱۲۔ سوئی گیس، بجلی اور پانی کے بِل امام خود ادا کر کے کمیٹی کو پیش کرے گا تاکہ ریکارڈ میں رکھے جائیں۔

۱۳۔ امام کو اپنے ساتھ مسجد کے مکان میں کسی عزیز رشتہ دار کو ٹھہرانے کی اجازت نہ ہوگی۔

۱۴۔ امام صاحب کو نمازوں کے اوقات میں اذان کے بعد مصلّی کے اریب قریب موجود رہنا ضروری ہے اور نماز کے بعد بھی دس منٹ تک وہ لازمی موجود رہے گا۔

۱۵۔ مسجد میں کوئی اضافی لائٹ یا پنکھا چلتا ہوا پایا گیا تو ذمہ داری امام صاحب پر ہوگی۔

۱۶۔ امام صاحب نمازوں میں کتھئی رنگ کی دستار پہنے گا اور اس کے اندر ٹوپی بھی ہونا ضروری ہے۔

۱۷۔ امام صاحب اگر کسی وقت مسجد چھوڑنا چاہیں تو درخواست دیں جس پر ایک ماہ میں غور کیا جائے گا۔

۱۸۔ مسجد کمیٹی اگر امام کو فارغ کرنا چاہے گی تو فوری نوٹس پر فارغ کر سکتی ہے۔

۱۹۔ امام مسجد، مسجد کی امامت کے علاوہ کوئی اور ذریعہ روزگار اختیار نہیں کر سکتا۔

۲۰۔ تنخواہ (۳۰۰۰ روپے) ہر ماہ کی دس تاریخ کو ادا کی جائے گی۔

۲۱۔ مندرجہ شرطوں میں سے کسی شرط کی خلاف ورزی پر امام کو نوٹس جاری کیا جائے گا۔

۲۲۔ امام مسجد اور کمیٹی کے مابین کسی تنازع کی صورت میں علامہ سید شاہ تراب الحق قادری صاحب کا فیصلہ آخری ہوگا۔

رطب ویابس (مجموعہ مقالات ومضامین)

اس کتاب میں ڈاکٹر شاہنواز صاحب کے حسب ذیل مقالات ومضامین شائع ہوئے ہیں۔

☆ قرآن وسیرت سے متعلق مضامین

۱۔اعجاز القرآن ۲۔قرآن غیر مسلموں سے نفرت کا درس نہیں دیتا

۳۔نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت حکم وقاضی ۴۔نقش نعلین رسول ﷺ کی برکات

☆ فقہی مضامین

۵اسلامی نظام حدود وتعزیرات کی حکمت ۶۔رحم کرائے پر لینے کی شرعی حیثیت

۷۔شکاگو تحریک اور شہادت کے تقاضے ۸۔رمضان المبارک تاریخی تناظر میں

۹۔نماز تراویح چند توجہ طلب پہلو ۱۰۔تعداد رکعت تراویح

۱۱۔ماہِ رجب کی مذہبی وتاریخی اہمیت ۱۲۔علامہ ابن سلام ہرویؒ

۱۳۔حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے فقہی افکار ونظریات

☆ شخصیات وبلاد پر مضامین

۱۴۔جنگ آزادی ۱۸۵۷ء اور مولانا فضل حق خیر آبادیؒ ۱۵۔علامہ محمد ابو زہرہ مصری

۱۶۔الشیخ علی طنطاوی ۱۷۔علامہ الشیخ عبدالفتاح ابوغدہ

۱۸۔ڈاکٹر عبدالجواد خلف اور جامعۃ الدراسات الاسلامیہ ۱۹۔جہد مسلسل کی کہانی

۲۰۔برونائی میں اسلام ۲۱۔دور وینز ویلا میں اسلام ۲۲۔عمان سلطان قابوس کی قیادت میں

☆ مختلف النوع مضامین

۲۳۔انسانیت کی پستی ۲۴۔مقصد تخلیق پاکستان

۲۵۔عربی مدارس کے لاکھوں طلبہ سوال کرتے ہیں ۲۶۔دینی مدارس میں درجہ بندی کا نقصان

۲۷۔نظامِ تعلیم ایک جائزہ ۲۸۔جنگ خلیج کے خفیہ گوشے ۲۹۔سعودی عربیہ کا سیاسی بحران ٹل گیا

۳۰۔تہذیب آگہی ۳۱۔زوال امت مسلمہ یا آزمائشِ ما

(یہ مقالات ہر شہر کے معروف کتب خانہ اور مجلہ فقہ اسلامی کے دفتر سے دستیاب ہیں)

نائب امام یا موذن

بعض شہری مساجد میں نائب امام و موذن دو الگ الگ عہدے ہیں جبکہ بعض میں موذن ہی نائب امام ہے۔ اگرچہ کتب فقہ کے مطابق موذن نائب امام ہو سکتا ہے بلکہ احادیث کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوات میں شرکت کے موقع پر مدینہ میں حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو قائم مقام یا نائب امام مقرر فرمایا جو موذن بھی تھے مگر وہ صحابی تھے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت طاہرہ میں رہ کر ان کی اس قدر تربیت ہو چکی تھی کہ آج کے علماء بھی ان کے علم و فضل کا کیا مقابلہ کریں گے۔ جبکہ ہماری مساجد کے نائب امام/ موذن کی صورت حال یہ ہے کہ بوقت تقرر یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ حافظ قرآن ہے؟'' اگر نہیں تو کم از کم کچھ سورتیں ہی اسے یاد ہوں اور اذان میں لہجہ خوب صورت ہو، اس کے علاوہ اس سے اور کچھ نہیں پوچھا جاتا۔ جبکہ کتب فقہ میں اس کی اہلیت پر مفصل بحث موجود ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ ''اذان کہنے کی اہلیت اس شخص میں ہے جو قبلہ اور نماز کے وقتوں کو پہچانتا ہو'' (بحوالہ فتاویٰ قاضی خان) اور چاہئے کہ موذن عاقل اور صالح اور متقی عالم سنت ہو (بحوالہ نہایہ) اور لائق وہ ہے جو ہیبت والا ہو اور لوگوں کے حال پر مہربانی کرتا ہو اور جو لوگ جماعت میں نہیں آتے ان پر زجر کرتا ہو (یعنی ان سے باز پرس اور ڈانٹ ڈپٹ کرے) (بحوالہ قنیہ) اور ہمیشہ اذان کہتا ہو (بحوالہ ہدایہ و تاتارخانیہ) اور ثواب کے واسطے اذان کہتا ہو (بحوالہ نہر الفائق) (۳۳)

نائب امام/ موذن کی ڈیوٹی:

شرعی اعتبار سے نائب امام یا موذن کی ڈیوٹی جبکہ یہ ایک ہی شخص ہو، امام کی موجودگی میں اذان کہنا اور امام کی غیر موجودگی میں اذان و جماعت (امامت) کرانا ہے، اور لوگوں کو نمازوں کی پابندی کی تاکید کرنا ہے۔ جبکہ جدید دور میں موذن کی ڈیوٹی انتظامیہ مسجد کی طرف سے یہ واجب قرار پائی ہے کہ جہاں خادم نہ ہو، وہ مسجد کی صفائی کرے اور صفیں بچھائے، جمعہ و تقریبات میں ٹینٹ شامیانہ لگائے۔ پانی کا اہتمام (موٹر چلانا اور ٹینکی بھرنا) اور وضو استنجاء خانہ کی صفائی سے پنکھوں اور دروازوں کی صفائی تک اسی کا کام ہے۔ علاوہ ازیں دو وقت (صبح و شام) مسجد میں محلہ کے بچوں کو تعلیم قرآن بھی اس کی ذمہ داری ہے۔ امام مسجد کی ذاتی اور چیئرمین مسجد کمیٹی یا متولی کے گھر کی ضروریات سودا سلف لانے کی ڈیوٹی بھی بعض مساجد میں اسی سے لی جاتی ہے۔ اگر مسجد کے ساتھ کوئی باغیچہ ہے تو اس کی باغبانی بھی موذن کے ذمہ ہے اور مسجد کے حجرہ، لاؤڈ اسپیکر، اسٹور اور باتھ روم کی کلید برداری بھی اسی کے نصیب میں ہے، علیٰ ھذا القیاس اس طرح کے تمام کام موذن یا نائب امام کے ساتھ مخصوص ہیں اور اس ساری محنت کے عوض اسے جو نذرانہ و وظیفہ ملتا ہے وہ قوت لایموت سے زیادہ نہیں ہوتا۔

کیا کبھی کسی ذمہ دار شخص نے اس پر بھی غور کیا کہ موذن یا نائب امام کو ملنے والا وظیفہ ایک عام مزدور کی روزانہ اجرت کے برابر بھی ہے؟ ہمارے خیال میں تو شاید امام و خطیب کو بھی اتنے پیسے نہ ملتے ہوں جتنے ایک ان پڑھ مزدور یا ٹھیلے والا کماتا ہے۔

موذن و اذان کی فضیلت:

فضائل موذن و اذان بہت ہیں ان میں سے چند ایک احادیث کے حوالہ سے یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

''حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''موذن کی آواز جہاں تک پہنچتی ہے وہاں

تک جن وانس اور جو چیز بھی اس کی آواز سنتی ہے وہ قیامت کے دن ضرور اس (مؤذن) کے حق میں شہادت دے گی۔'' (صحیح بخاری)

''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ ''اذان کہنے والے قیامت کے دن سب لوگوں کے مقابلے میں دراز گردن (سربلند) ہوں گے۔'' (صحیح مسلم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ کے جس بندے نے سات سال تک اللہ کے واسطے اور ثواب کی نیت سے اذان دی اس کیلئے آتش دوزخ سے برأت لکھ دی جاتی ہے۔ (جامع ترمذی، سنن ابوداؤد، سنن ابن ماجہ)

خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اذان دی ہے امام ترمذی کی بیان کردہ ایک روایت کے مطابق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سفر میں اذان دی۔ (جامع ترمذی)

مؤذن کی صفات:

مؤذن کی صفات میں سے بعض کا ذکر اوپر ہو چکا، مزید یہ کہ مؤذن کو وقت سے پہلے اور بے وضو اذان نہ کہنا چاہئے۔ وقت سے پہلے دی گئی اذان وقت پر قابل اعادہ ہے جبکہ بے وضو کی اذان اگرچہ قابل اعادہ نہیں تاہم اس کو معمول بنا لینا درست نہیں۔ اچھا مؤذن وہ ہے جو وقت پر باوضو اور ثواب کی نیت سے اذان دے۔ نابینا مؤذن کی اذان جائز ہے بشرطیکہ اسے وقت کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہو یا کوئی وقت بتانے والا ہو، آج کل ایسی گھڑیاں ایجاد ہو چکی ہیں جن سے نابینا بھی صحیح وقت معلوم کر لیتے ہیں۔

اقامت کس کا حق ہے؟

اذان کے بعد اقامت اسی شخص کا حق ہے جس نے اذان کہی، اگر کوئی دوسرا شخص

اقامت کہے تو اذان دینے والے سے اجازت لے۔ بغیر اجازت اقامت نہ کہے اور اگر اسے معلوم ہو کہ اقامت کہنے سے اذان دینے والے کو ملال نہ ہوگا تو کہہ سکتا ہے اگرچہ بغیر اجازت کہے۔ کافی کے حوالہ سے فتاویٰ عالمگیری میں لکھا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ مؤذن ہی اقامت کہے۔ مؤذن کو اذان کے بعد مسجد سے چلے جانا مناسب نہیں۔ لیکن اگر اس نے ایسا کیا تو گناہگار نہیں ہوگا۔ تاہم مؤذن کو ایسا کرنا نہیں چاہیے۔

اذان کے پیسے:

ہمارے ایک جاننے والے مؤذن نے بتایا کہ متولی مسجد سے اس کا جھگڑا رہتا تھا اور متولی ہمیشہ یہ طعنہ دیتا کہ ہم تمہیں ''اذان کے پیسے'' دیتے ہیں۔ ایک روز میں نے اذان دی اور اس کے بعد نماز (جماعت) سے ذرا دیر قبل میں مسجد سے جانے لگا تو متولی نے کہا کہاں جا رہے ہو، میں نے کہا جہاں بھی جاؤں، تم اذان کے پیسے دیتے ہو سو اذان میں نے کہہ دی اب اقامت خود کہہ لینا۔

خطیب

معاشرہ میں خطیب کی جو اہمیت ہے وہ کسی سے مخفی نہیں، مساجد میں جمعہ و دیگر اہم مواقع پر ایک اچھا خطیب ہی اصلاح معاشرہ کا اہم فریضہ انجام دیتا ہے اس کی تقاریر کے نتیجہ میں لوگوں میں نیکی کی طرف رغبت اور برائیوں سے بے رغبتی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اچھی اور مؤثر تقریر یقیناً اصلاح کا باعث بنتی ہے۔ ایک خطیب میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں اس کا احاطہ کرنا مشکل ہے ہاں البتہ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''ہر خوبی خطیب میں ہونی چاہئے اور کوئی خرابی اس کے قریب سے بھی نہ گزرنے پائے۔'' اگرچہ انسان ہونے کے ناطے امکان خوبیوں اور خرابیوں دونوں کا ہے مگر جس کی خوبیاں اس کی خرابیوں پر غالب ہوں وہ خوبیوں والا اور کامیاب انسان ہی متصور ہوگا۔ ذیل میں ہم خطیب کی چند صفات کا ذکر کرتے ہیں۔

خطیب یا مبلغ کی صفات:

یہ ضروری ہے کہ مبلغ دین کا علم اور سمجھ رکھنے والا اور جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اور جس چیز کی طرف بلا رہا ہے اس پر عمل کرنے والا ہو اچھی خصلتیں اور اچھی صفات کا حامل ہو۔ اللہ کی طرف بلانے والے راستہ میں مشکلات پر صبر کرنے والا اور تکالیف کو تحمل و بردباری سے برداشت کرنے والا ہو۔ اس کی زبان میں شیرینی اور اس کے مزاج میں درگزر کرنے کا مادہ

ہو اس لئے کہ مبلغ درحقیقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نائب ہے لہٰذا جس کا نائب ہے اس کی صفات سے اس کا متصف ہونا ضروری ہے۔

مبلغ یا داعی کی تمام صفات میں سب سے پہلی صفت، صفت علم ہے۔ داعی کے لئے عالم ہونا ضروری ہے اور یہ بھی کہ وہ اپنے علم میں اضافہ کرتا رہے جس کے لئے وہ تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت النبی وغیرہ کی کتابیں مطالعہ کرے اور دیگر مبلغین اور مجاہدین کی تاریخ دعوت وعزیمت سے آشنا اور آگاہ ہو اور ان مضامین سے متعلق کتب کے ذخیرہ سے اپنے علم کو مزید ترقی دے اور جس چیز کی طرف وہ لوگوں کو دعوت دے رہا ہو اس میں اس کو بصیرت اور عبور حاصل ہو جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ جس کا مفہوم ہے:

"اے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کہہ دیجئے کہ میرا طریق یہی ہے کہ میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں میں اور میرے پیروکار دلیل پر قائم ہیں، پاک ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور میں مشرکوں میں سے نہیں۔"

(سورہ یوسف، آیت ۱۰۸)

چونکہ خطیب لوگوں کو پروردگار کے راستہ کی طرف بلاتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ وہ اس راستہ کے تمام مقتضیات اور معلومات سے واقف ہو اور جب وہ لوگوں کو اچھی چیزوں کی طرف بلا رہا ہے اور بری چیزوں سے روک رہا ہے تو یہ اچھائی اور برائی کی معرفت بغیر علم کے حاصل نہیں ہوسکتی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو کہ تمام لوگوں سے زیادہ عالم تھے ان کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت فرمائی کہ آپ کثرت سے یہ دعا مانگیں

"رَبِّ زِدْنِی عِلْمًا" (اے میرے رب! میرے علم میں اضافہ فرما۔)

مبلغ داعی کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس جو علم ہے اور جس چیز کی طرف وہ لوگوں کو بلا رہا ہے اس پر اس کا عمل بھی ہو، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس چیز کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر سب سے پہلے عمل کرنے والے ہوتے تھے اور ان کے لئے عمل کا ایک نمونہ پیش فرماتے تاکہ لوگ اس نمونہ عمل کی اقتداء کریں۔ جب نماز پڑھنے کا حکم نازل ہوا تو آپ ﷺ نے پہلے خود نماز ادا فرمائی اور اس کے بعد صحابہ کرام سے فرمایا "اس طرح نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔"

جب آپ ﷺ نے حج ادا فرمایا تو اس وقت یہ اعلان فرمایا کہ مجھ سے اپنے حج کے اعمال سیکھ لو۔ جب داعی اس عمل پر خود عمل پیرا ہو جس کی طرف وہ دعوت دے رہا ہے تو وہ بات دل میں مضبوطی سے جاگزیں ہوتی ہے اور مخاطب اس کو پوری بصیرت اور خوش دلی سے قبول کرتا ہے جب بات دل سے نکلتی ہے تو دل میں جاگزیں ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر سخت نکیر فرمائی ہے۔ جو لوگ اپنے کہے ہوئے پر عمل نہیں کرتے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے جس کا مفہوم ہے:

"اے ایمان والو! ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو، اللہ کے نزدیک یہ بات بہت ناراضگی کی ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں۔"

(سورہ صف، آیت نمبر ۳)

اسی طرح حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو مخاطب کر کے فرمایا۔ اور میں نہیں چاہتا کہ تمہارے برخلاف ان کاموں کو کروں جن سے میں تمہیں روکتا ہوں میں تو بس اصلاح ہی چاہتا ہوں جہاں تک میں کر سکوں اور مجھے جو کچھ توفیق ہوتی ہے اللہ ہی کی طرف سے اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ (سورہ ہود، آیت نمبر ۸۸)

داعی کے لئے ضروری ہے کہ وہ سلامت قلب اور پاکیزگی روح کے ساتھ متصف ہو اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کا تعلق نہایت مضبوط ہو اور تعلق باللہ فرائض پر پابندی کے ساتھ عمل، رات کی نماز اور کثرت ذکر سے حاصل ہو گا اس لئے کہ ذکر الٰہی سے دل و دماغ کو جلا ملتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "دل زنگ آلودہ ہو جاتے ہیں ان کی چمک اللہ کے ذکر سے بحال ہوتی ہے۔"

داعی کو چاہئے کہ وہ کچھ وقت اپنے رب کے ساتھ تخلیہ کے لئے فارغ رکھے۔

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی فرماتے ہیں۔

اللہ کی طرف بلانے والے کے لئے ضروری ہے کہ کچھ اوقات فارغ کرے جن میں وہ اللہ جل شانہٗ کے ساتھ اپنی روح کے تعلق کو مضبوط کرے۔ ان اوقات میں وہ برے اخلاق کی کدورتوں سے اپنے نفس کو پاک کرے اور اپنے گرد و پیش کی منتشر زندگی سے

پرسکون ہو جائے اور تخلیہ کے ان اوقات میں اپنے نفس کا محاسبہ کرے کہ اس نے بھلائی میں کیا کوتاہی کی؟ کہاں اس کے قدم متزلزل ہوئے؟ کہاں اس نے حکمت تبلیغ اور منہج دعوت میں غلطی کی؟

ان امور کا محاسبہ کرے ان کے ازالہ کی تدبیر سوچے اور ان اوقات تخلیہ میں وہ آخرت، جنت، دوزخ، موت اور اس کی ہولناکیوں کا تصور کرے ان اوقات تخلیہ میں ذکر الٰہی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نماز تہجد اور قیام اللیل فرض تھی جب کہ امت کے دیگر افراد کے حق میں مستحب ہے اس نماز تہجد کی سب سے زیادہ ضرورت مبلغین کو ہے اور پھر رات کے آخری حصہ میں تخلیہ اور نماز تہجد کی لذت سے وہی شخص آشنا ہو سکتا ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے اس نعمت سے سرفراز فرمایا ہو۔''

ضروری ہے کہ مبلغ پاکیزہ اخلاق اور اچھی صفات مثلاً صبر، بردباری، نرم مزاجی، عفو و درگزر اور لوگوں پر شفقت جیسی صفات سے متصف ہو جیسے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم متصف تھے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اخلاق حمیدہ اور صفات پاکیزہ کے اعلیٰ رتبہ پر فائز ہونے کی خبر قرآن کریم کی اس آیت کے ذریعے دی جس کا مفہوم ہے کہ:

''اور بیشک آپ اخلاق کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہیں۔'' (سورۃ القلم، آیت ۴)

اس طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے جس کا مفہوم ہے:

''پھر یہ اللہ کی رحمت ہی کے سبب سے ہے کہ آپ ان کے ساتھ نرم رہے اور اگر آپ تند خو، سخت طبع ہوتے تو لوگ آپ کے پاس سے منتشر ہو گئے ہوتے سو آپ ان سے درگزر کیجئے اور ان کے لئے استغفار کر دیجئے اور ان سے معاملات میں مشورہ لیتے رہئے۔''

(سورہ آل عمران، آیت نمبر ۱۵۹)

ارشاد ربانی ہے جس کا مفہوم ہے:

(بے شک تمہارے پاس ایک پیغمبر آئے ہیں تمہاری ہی جنس میں

ے، جو چیز تمہیں نقصان پہنچاتی ہے انہیں بہت گراں گزرتی ہے
تمہاری بھلائی کے حریص ہیں ایمان والوں کے حق میں تو بڑے ہی
شفیق ہیں مہربان ہیں۔) (سورہ توبہ، آیت نمبر ۱۲۸)
''اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''
(سورۃ الانبیاء، آیت نمبر ۱۰۷)

وہ شخص جس کو اللہ نے مبلغ اور داعی جیسے اہم اور مقدس منصب کیلئے پسند فرمایا ہے وہ اس بات کو ایک لحہ کے لئے بھی نظرانداز نہ کرے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نائب ہے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو حتی الوسع اور اپنی استعداد اور دائرہ کار میں مخلوق تک پہنچانے کا ذمہ دار ہے۔

دعوت کا طریقہ کار:

لازمی ہے کہ داعی اور مبلغ عقل وفراست سے معمور ہو، جنہیں دعوت دے رہا ہو، ان کی صلاحیت وحیثیت کے مطابق اس کو اسلوب دعوت میں تبدیلی پر عبور حاصل ہو اگر اس کے مخاطب غیر مسلم ہوں تو چاہئے کہ وہ محض بنیادی عقائد اور ایمان کی طرف بلائے اور اس مقصد کے لئے حکمت ودانشمندی کے ساتھ اسلام کی اچھائیوں اور خوبیوں کو پیش کرے اور اگر اس کے مخاطب اہل اسلام ہوں تو اس کی دعوت اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت اور ان کی اطاعت، تزکیہ نفس، اصلاح عمل خدا ترسی، بھلائی کی جانب ہونی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ نے طریق دعوت کو بیان کر دیا ہے ارشاد ہوتا ہے:

''بلایئے اپنے رب کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ذریعہ اور ان سے لڑو اس طریقہ سے جو عمدہ ہے بیشک آپ کا رب خوب واقف ہے اس سے بھی جو اس کی راہ سے بھٹک گیا اور وہ اس سے بھی خوب واقف ہے جو ہدایت یافتہ لوگوں میں سے ہے۔'' (سورہ نحل، آیت نمبر ۱۲۵)

اللہ تبارک وتعالیٰ نے صراطِ مستقیم کی طرف لوگوں کو بلانے کے لئے تین طریقے بتلائے ہیں، حِكْمَةٌ، مَوْعِظَةٌ حَسَنَةٌ اور جَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حکمت سے مراد یہ ہے کہ نہایت پختہ اور اٹل مضامین مضبوط دلائل اور براہین کی روشنی میں حکیمانہ انداز میں پیش کئے جائیں جن کو سن کر فہم وادراک اور علمی ذوق رکھنے والا طبقہ گردن جھکا سکے، دنیا کے خیالی فلسفے ان کے سامنے ماند پڑ جائیں اور کسی قسم کی عملی و دماغی ترقیات وحی الٰہی کی بیان کردہ حقائق کا ایک شوشہ تبدیل نہ کرسکیں، موعظة حسنة مؤثر اور رقت انگیز نصیحتوں سے عبارت ہے جس میں نرم خوئی اور دل سوزی کی روح بھری ہو، اخلاص ہمدردی اور شفقت وحسن اخلاق سے خوب صورت اور معتدل پیرایہ میں جو نصیحت کی جاتی ہے بسا اوقات اس سے پتھر دل بھی موم ہو جاتے ہیں، مردوں میں جانیں پڑ جاتی ہیں ایک مایوس مردہ قوم جھرجھری لے کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ لوگ ترغیب وترہیب کے مضامین سن کر منزل مقصود کی طرف بے تابانہ دوڑنے لگتے ہیں اور بالخصوص جو زیادہ عالی دماغ اور ذکی وفہیم نہیں ہوتے مگر طلب حق کی چنگاری سینے میں رکھتے ہیں ان میں مؤثر وعظ وپند سے عمل کی ایسی اسٹیم بھری جاسکتی ہے جو بڑی اونچی عالمانہ تحقیقات سے ممکن نہیں، ہاں دنیا میں ہمیشہ سے ایک ایسی جماعت موجود رہی ہے کہ جن کا کام الجھنا اور بات بات میں حجتیں نکالنا اور کج بحثی کرنا ہے یہ لوگ نہ حکمت کی باتیں قبول کرتے ہیں اور نہ وعظ ونصیحت سنتے ہیں بلکہ چاہتے ہیں کہ ہر مسئلہ میں بحث ومناظرہ کا بازار گرم ہو بعض اوقات اہل فہم وانصاف اور طالبین حق کو بھی شبہات گھیر لیتے ہیں اور بدون بحث کے تسلی نہیں ہوتی اس لئے وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فرمادیا کہ اگر ایسا موقعہ پیش آئے تو بہترین طریقے سے تہذیب، شائستگی، حق شناسی اور انصاف کیساتھ بحث کرو اپنے حریف ومقابل کو الزام دو تو بہترین اسلوب سے دو خواہی نہ خواہی دل آزار اور جگر خراش باتیں مت کرو جس سے قضیہ بڑھے اور معاملہ طول کھینچے مقصود تفہیم اور احقاق حق ہونا چاہئے خشونت بداخلاقی کینہ پروری اور ہٹ دھرمی سے کچھ نتیجہ نہیں۔

ہر وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے علم دین کے اعزاز سے مشرف فرمایا ہے وہ چاہے منصب امامت یا خطابت پر فائز ہو یا استاد ہو یا وہ زندگی کے کسی بھی میدان میں سرگرمِ عمل ہو

اسے یہ ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ وہ مبلغ ہے اللہ کے دین کی طرف لوگوں کو بلانے والا ہے اور یہ کہ دعوت وتبلیغ یہ علماء کے فرض منصبی میں داخل ہے اور اس طرح ہر مسلمان اپنے علم اور فہم کے مطابق دین کا داعی اور مبلغ ہے، ارشاد ربانی ہے، جس کا مفہوم ہے:

''تم بہترین امت ہو، جو نکالی گئی ہے لوگوں کیلئے تاکہ تم نیک کاموں کی طرف بلاؤ اور برے کاموں سے روکو۔'' (آل عمران' آیت ۱۱۰)

حدیث مبارکہ:

''میری باتیں لوگوں تک پہنچاؤ چاہے ایک چھوٹی سی آیت ہی کیوں نہ ہو۔''

علماءِ کرام، خطباءِ عظام اور مدرسین واساتذہ پر یہ اللہ کا خاص فضل ہے کہ لوگ ان کے پاس خود آتے ہیں اور ان کی مجلسوں میں حاضر ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ نے عامۃ المسلمین کے دلوں میں علماء، خطباء اور اساتذہ کی محبت اور ان کا احترام جاگزیں کر دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ عام لوگ نصیحتوں کو غور سے سنتے ہیں۔ عامۃ المسلمین روزانہ پانچ مرتبہ مساجد میں حاضر ہوتے ہیں نماز جمعہ، عیدین اور دیگر خاص مواقع پر بھی آتے ہیں اور اپنے سال کا بیشتر حصہ اپنے استاد کے پاس گزارتے ہیں لہٰذا ہم پر واجب ہے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھائیں اور فرصت کے ان اوقات کو استعمال میں لاتے ہوئے دعوت وتبلیغ کے اس فریضہ کو کماحقہ بجالانے کی کوشش کریں۔

اسی طرح ہم میں سے ہر شخص کیلئے ضروری ہے کہ وہ دعوت وتبلیغ کیلئے ایک خاص لائحہ عمل مرتب کرے اور عمدہ اسلوب اپنائے خصوصاً آئمہ وخطباء کا عام مسلمانوں سے سب سے زیادہ ربط ہوتا ہے اور ان کی دعوت کے میدان مسجد، محراب ومنبر اور دینی اجتماعات ہیں لہٰذا انہیں چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو کمال عمل اور اچھے اخلاق سے متصف کریں تاکہ وہ بہترین معلم، بہترین تربیت دینے والے اور بہترین مرشد ثابت ہوں۔

اسلامی بنکاری

اور

سودی بنکاری میں فرق

کے حوالہ سے

بعض سوالات کے جوابات

پروفیسر ڈاکٹر نور احمد شاہتاز

ماڈرن اسلامک فقہ اکیڈمی کراچی

تقریر کیسی ہو؟

خطباء اور علماء کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ ایک موضوع پر ایک تقریر یاد کر کے ہر جمعہ اور ہر دینی اجتماع کے موقع پر اسی کو دہراتے رہیں بلکہ ان پر لازم ہے کہ وہ مختلف موضوعات کے لئے تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت اور تاریخ اسلام کے ذخیرہ کتب سے اپنے علم میں دن بدن اضافہ کرتے رہیں۔ مبلغین کی سیرت اور ان کے طرز اور اسلوب کا مطالعہ کریں اور اس موضوع پر باعمل علماء سے مذاکرہ کریں اور ان کے تجربوں سے استفادہ کریں جب کوئی مبلغ اپنے خطبہ جمعہ یا کسی وعظ و نصیحت کی مجلس سے خطاب کرے تو اس کے لئے کوئی ایسا موضوع متعین کرے جس کی لوگوں کو سخت ضرورت ہو اور پھر اس موضوع کو لوگوں کے سامنے بیان کرنے سے قبل ضبط تحریر میں لائے یا اسے اپنے ذہن میں ترتیب دے تا کہ لوگوں کے سامنے بیان کرنے سے قبل مرتب اور مربوط انداز میں بیان کیا جا سکے۔ موضوع کو دلائل سے مزین کرنے کے لئے اس موضوع کی بنیاد ایسی آیات قرآنی پر رکھے کہ جو اس موضوع سے متعلق ہیں اس لئے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے (جس کا مفہوم ہے):

''آپ قرآن کے ذریعہ سے نصیحت کرتے رہئے اسے جو میری وعید سے ڈرتا ہو۔'' (سورہ ق آیت ۴۵)

پھر اس آیت قرآنی کی تشریح، احادیث نبویہ کی روشنی میں کریں اس لئے کہ یہ احادیث نبویہ قرآن کریم کی سب سے بہترین تشریح و تفسیر ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے جس کا مفہوم ہے:

''اور ہم نے آپ پر بھی یہ نصیحت نامہ اتارا ہے تا کہ آپ لوگوں پر ظاہر کر دیں جو کچھ ان کے پاس بھیجا گیا ہے اور تا کہ وہ غور و فکر سے کام لیا کریں۔'' (سورۃ النحل، آیت ۴۴)

پھر اس موضوع سے متعلق صحابہ کرام، سلف صالحین اور تاریخ اسلام کی دیگر اہم شخصیات کی زندگی کے حوالہ سے مثالیں پیش کرے تا کہ لوگوں کے سامنے موضوع سے متعلق عملی نمونہ بھی موجود ہو اور یہ عملی نمونہ آگے عمل کرنے والوں کے لئے مشعل راہ بن سکے۔ خطیب اور مبلغ کو چاہئے کہ وہ وعظ و نصیحت کے لئے مفید اسلوب اور انداز اختیار کرے۔ اس کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات اور مشہور مبلغین اور واعظوں کے خطبوں اور تقاریر سے بھی استفادہ کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ حاضرین مجلس اور مخاطب کے نشاط اور چستی کا بھی خیال رکھے۔ ایسا انداز اختیار نہ کرے کہ جس سے لوگ بیزار ہونے لگیں اور موضوع کی طوالت سستی کا باعث بن جائے۔

ابو وائل کی روایت ہے ''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ہر جمعرات کو ہمیں وعظ و نصیحت فرمایا کرتے تھے یعنی ہفتہ میں ایک مرتبہ، اس پر ایک شخص نے ان سے درخواست کی کہ آپ ہمیں روزانہ وعظ و نصیحت فرمایا کریں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ مجھے یہ پسند نہیں کہ میں تمہیں تنگ کروں بلکہ میں تم کو کبھی کبھی وعظ و نصیحت کرتا ہوں۔ جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں کبھی کبھی نصیحت فرماتے تھے ہماری تنگی کے خوف سے۔'' خطیب مبلغ کو چاہئے کہ وہ لوگوں سے ان کی عقل و فہم کے مطابق بات کرے خطبہ میں ایسی باتیں نہ بیان کرے جو عوام نہ سمجھ سکتے ہوں اور جس کے ادراک سے ان کی عقل قاصر ہو۔

نااہل لوگوں کا تقرر اور اس کا نتیجہ:

واعظ یا خطیب کے لئے شاہ ولی اللہؒ کے بیان کردہ اوصاف کی روشنی میں جب ہم اپنے ائمہ وخطباء کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ افسوس ناک صورت حال نظر آتی ہے کہ ہمارے امام وخطیب صاحبان کی اکثریت (الا ماشاء اللہ) قرآن وحدیث سے گہری واقفیت اور کتاب و سنت کا درس تو بہت دور کی بات ہے قرآن مجید کا سادہ ترجمہ تک نہیں سمجھتے۔ علم حدیث اور اصول حدیث سے بالکل واقفیت نہیں۔ حدیث کی صحت اور عدم صحت کا پتہ نہیں۔ ''ضرب زید'' کی نحوی ترکیب تک نہیں سمجھتے۔ یہ صورت حال اکثر خطیب صاحبان (الا ماشاء اللہ) کی ہے ان کی پہنچ صرف اردو میں لکھی گئی وعظ وخطبہ کی کتابوں تک ہے۔ براہ راست قرآن و حدیث اور امہات الکتب سے استفادہ کرنا ان کے بس کا روگ نہیں۔ اردو میں بھی بس اپنے ''مکتبہ فکر'' یا ''مسلک'' کی کتابوں تک مطالعہ محدود رہتا ہے۔

چنانچہ یہ مشاہدہ ہے کہ ہمارے ائمہ وخطبہ کی اکثریت رفع یدین، آمین بالجہر، قرأت خلف الامام، نور بشر، حاضر ناظر، علم غیب اور ایصال ثواب وغیرہ جیسے اختلافی مسائل پر تو گھنٹوں تقریر کر لے گی اور اگر ان سے گزارش کی جائے کہ اسلام کے معاشی نظام، سودی معیشت کے نقصانات، سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیاں، اسلام کے عادلانہ نظام کی برکات، اسلامی حدود وتعزیرات، اسلام کے بین الاقوامی اصول وتصورات، اسلام کے تصور جنگ، اسلام کے معاشرتی نظام اور اسلام کے سیاسی نظام وغیرہ پر کچھ بیان فرمادیں تو شاید ہی کچھ بیان کرسکیں۔

مسلک کی حد تک محدود رہنے کے نتیجے میں آج ہمارے معاشرے میں فرقہ واریت کا ناسور اتنا پھیل چکا ہے اور اتنی جڑیں پکڑ چکا ہے اتنا بعد اور دوری پیدا ہو چکی ہے کہ ایک مسلک کا آدمی دوسرے مسلک کے آدمی کو مسلمان سمجھنے اور اپنے مسلک کی مسجد میں اسے دیکھنے کے لئے تیار نہیں۔ اس فرقہ واریت نے ہر آدمی کو مشکل میں ڈال رکھا ہے۔ ہر آدمی پریشان ہے کہ کس مسلک کی بات مانی جائے اور کس کی نہ مانی جائے۔ کون سا اسلام قبول کیا جائے اور کون سا اسلام قبول نہ کیا جائے۔ اختلاف مسائل تک محدود خطبوں اور تقریروں نے

مساجد کو غیر آباد کر کے رکھ دیا ہے۔ نمازی انتظار میں رہتے ہیں کہ "علامہ صاحب" کا خطبہ کب ختم ہو گا اور نماز کا وقت قریب ہو گا تو مسجد جائیں گے۔ اور اس طرح کتنے ہی نمازی "انتظار الصلوٰۃ" کے اور مسجد میں پہلے بیٹھنے کے ثواب سے محروم رہتے ہیں۔ (حافظ محمد سعد اللہ، ہفت روزہ تعبیر، ستمبر ۹۶)

خطبہ وتقریر کا انداز:

خطیب کو چاہئے کہ خطبہ اور تقریر ٹھہر ٹھہر کر سمجھانے والے انداز میں کرے تاکہ ہر سننے والا اس کو سمجھ سکے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ میں اس قدر ٹھہراؤ ہوتا کہ سننے والا اس کو سمجھ لیتا تھا۔ خطیب کو چاہئے کہ اس کا خطبہ تقریر اس قدر بلیغ اور فصیح ہو کہ جس کے سننے سے سامعین کے قلوب جھوم اٹھیں۔ اس کی تقریر سے لوگوں میں عمل کی رغبت پیدا ہو اور آخرت کی یاد تازہ ہو۔

خطیب کے لئے ضروری ہے کہ وہ منبر کے لئے ایسے موضوع کا انتخاب کرے جو تمام مسلک والوں کے لئے متفق علیہ ہو، ایسے امور کو نہ چھیڑے جو فروعی اور اجتہادی ہوں اور جن امور میں شریعت نے لچک اور وسعت رکھی ہو۔ یہ فروعی موضوعات درس و تدریس میں اور درس گاہ میں بیان کرنے کے ہیں۔ خطیب ایسے موضوعات پر بات نہ کرے جس سے امت مسلمہ میں تفرقہ اور اختلاف کا اندیشہ ہو، ہمیشہ اتحادِ امت کو اپنا نصب العین رکھے۔ ہمارے لئے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا عمل مثالی نمونہ ہے، غزوۂ احزاب کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی ایک جماعت کو بنو قریظہ کی طرف روانہ کیا اور ان کو یہ ہدایت کی کہ "تم بنو قریظہ ہی پہنچ کر عصر کی نماز پڑھنا" صحابہ کرام رضی اللہ عنہم چل پڑے یہاں تک کہ وہ ابھی راستہ ہی میں تھے کہ عصر کی نماز کا وقت ہو گیا بعض صحابہ نے عصر کی نماز پڑھ لی، انہوں نے آپ ﷺ کے اس ارشاد کا یہ مطلب سمجھا کہ ہم بنو قریظہ پہنچنے میں حتی الامکان جلدی کریں لیکن اب جب کہ ہم وہاں نہیں پہنچ سکے اور عصر کی نماز کا وقت ہو گیا ہے تو ہمیں عصر کی نماز قضاء نہیں کرنی چاہئے گویا انہوں نے اس ارشاد کے مجاز پر عمل کیا جب کہ

اس جماعت کے بعض افراد نے اس ارشاد کی حقیقت پر عمل کیا۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں حکم ہی یہ ہے کہ بنو قریظہ پہنچ کر نماز پڑھیں اور اس سے پہلے نماز عصر ہرگز ادا نہ کریں اگرچہ وہ قضا ہی کیوں نہ ہو جائے چنانچہ ان حضرات نے عصر کا وقت ختم ہو جانے کے بعد قریظہ پہنچ کر نماز عصر پڑھی جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع دی گئی تو آپ ﷺ نے ان دونوں گروہوں میں سے کسی پر نکیر نہیں فرمائی۔

اس واقعہ سے یہ سبق ملتا ہے کہ صحابہ کے درمیان بھی آپ ﷺ کے ارشادات کو سمجھنے میں اختلاف ہوا حالانکہ انہوں نے بغیر کسی واسطہ کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست تمام ارشادات سنے اس کے باوجود ان میں کسی بات کو سمجھنے میں اختلاف ہوا اور ہر ایک جماعت نے اپنی فہم اور سمجھ کے مطابق اس کو منشاء نبوی سمجھ کر اس پر عمل کیا لیکن ان میں کسی بھی وقت تفرقہ اور انتشار پیدا نہیں ہوا وہ جس طرح اختلاف سے قبل آپس میں محبت کرنے والے بھائی تھے اسی طرح اختلاف کے بعد بھی ان کی محبت میں ذرہ برابر کمی نہیں آئی اور وہ اپنے مشترکہ دشمن یہود کے سامنے ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر رہے۔

ائمہ مساجد اور خطباء ان تمام مسلمانوں کی اصلاح کے ذمہ دار ہیں جو ان کی امامت میں نماز ادا کرتے ہیں جو ان کے پیچھے نماز جمعہ پڑھتے ہیں اور ان کا وعظ وارشاد سنتے ہیں، یہ خطباء اور آئمہ ان عامۃ المسلمین کو حلال وحرام کی تعلیم دینے اور ان میں فرق بتلانے کے اور ان کی دینی تربیت کے ذمہ دار ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور اس سے اس کے زیردست کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ امام مسجد کو چاہئے کہ وہ محلہ اور علاقہ کے لوگوں کی اصلاح اور تربیت کے لئے ایک مناسب پروگرام ترتیب دے اور پنج وقتہ نمازوں میں سے کسی ایک نماز کے بعد جس میں نماز پڑھنے والوں کی تعداد زیادہ ہو ہفتہ عشرہ میں ایک بار ان کو درس دے جس میں ان کو اسلام کے بنیادی عقائد، عبادات و معاملات اور اخلاق کے متعلق بتائے اور اس کے لئے بہترین طریقہ یہ ہے کہ پہلے سے درس کے لئے موضوعات منتخب کرے اور ہر موضوع پر مقررہ دن کسی ایک نماز کے بعد درس دے اور اس درس کی

پابندی کرے چاہے تھوڑا ہی کیوں نہ ہو اس لئے کہ سب سے زیادہ پسندیدہ عمل وہی ہے جو پابندی سے کیا جائے۔ اگرچہ کم ہو، جہاں تک مدرس اور استاد کی تبلیغی ذمہ داریوں کا تعلق ہے تو وہ اساتذہ جو اسلامی جامعات اور مدارس میں تدریس کا فریضہ انجام دے رہے ہیں انہیں یہ بات خوب ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ وہ اس امت کے علماء اور مبلغین کو تیار کر رہے ہیں لہٰذا ان کی جدوجہد نہایت محنت، عرق ریزی، وسعت اور اخلاص نیت کا تقاضا کرتی ہے۔

علماء کے لئے امام محمد کا سبق آموز واقعہ:

امام اعظم امام ابوحنیفہؒ کے نامور شاگرد امام محمد بن حسن شیبانیؒ کے ذوق مطالعہ اور دین سے ناواقف لوگوں کی خاطر رات رات بھر مسائل شرعیہ کے دیکھنے کا ایمان افروز اور علماء کے لئے سبق آموز واقعے کا ذکر فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ امام محمدؒ راتوں میں کتابوں کے مطالعہ کے عادی تھے۔ موسم گرما میں یہ حال ہوتا کہ کتاب کھلی ہوئی ہے بدن کا کرتا اترا ہوا ہے اور پانی سے بھرا طشت سامنے ہے جب نیند کا غلبہ ہوتا تو طشت سے پانی لے کر آنکھوں پر چھینٹے مارتے تاکہ نیند دور ہو جائے اور پوری بیداری اور تیقظ کے ساتھ اپنا مطالعہ جاری رکھ سکیں اور نئے نئے پیش آمدہ مسائل کا استخراج واستنباط کر سکیں۔ رات کے اس مسلسل عمل اور مطالعے نے جب ان کی صحت پر مضر اثرات ڈالنے شروع کیے تو ایک رات ان کے چند رفقاء بہی خواہ ان کی خدمت میں آئے اور کہا: آپ یوں مسلسل نہ جاگیں، رات کو کچھ سویا بھی کریں ورنہ آپ کی صحت بالکل جواب دے جائے گی۔ رفقاء کی اس ہمدردانہ بات کو سن کر امام محمد نے جو خوب صورت اور دور اندیشانہ جواب دیا وہ سونے سے لکھنے کے قابل اور علماء کے لئے ایک سبق ہے۔ فرمایا لوگ تو اس بھروسہ پر سو رہے ہیں کہ کوئی نیا مسئلہ ہمارے سامنے آئے گا تو (امام) محمد کے پاس چلے جائیں گے۔ بتاؤ (امام) محمد بھی اگر سو جائے تو لوگ پھر کہاں جائیں گے۔"

(مجلہ فقہ اسلامی، ص ۱۷-۱۶، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)

(دوسرے سیمینار میں پیش کردہ مقالات کا مجموعہ)

جدید درسگاہوں کے اساتذہ:

وہ اساتذہ جو جدید یونیورسٹیوں اور کالجوں میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں ان کی ذمہ داریاں بھی کچھ کم نہیں ہیں اس لئے کہ ان کے زیر نگرانی و زیر تربیت وہ جدید طبقہ ہے جسے آگے چل کر زندگی کے ہر شعبہ میں مختلف امور کی ذمہ داریاں سنبھالنی ہیں، اگر یہ اساتذہ اس نوجوان طبقہ کی تربیت حکیمانہ طریقہ سے انجام دیتے ہیں اور ان کے اندر روح ایمانی کی ترویج کر دیتے ہیں تو یہ اساتذہ ایک نہایت اہم کام کو انجام دینے کے اعتبار سے پوری امت مسلمہ کی جانب سے نہایت شکریہ کے قابل ہیں اور ان کی اس محنت کے مستقبل میں بہت اچھے نتائج ظاہر ہوں گے۔

دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری بہت بڑی ذمہ داری ہے اس لئے کہ درحقیقت یہ سرور انبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت کا منصب ہے لیکن ایک بہت بڑی ذمہ داری کے ساتھ یہ ایک بہت جلیل القدر منصب بھی ہے اور خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ اس منصب کے لئے قبول فرمالیں۔

ارشاد ربانی ہے جس کا مفہوم ہے:

> ''اور اس سے بہتر بات کس کی ہے جو دوسروں کو اللہ کی طرف بلائے اور خود نیک عمل کرے اور کہے کہ میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔''
>
> (سورہ فصلت، آیت ۳۳)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

> ''جس نے لوگوں کو ہدایت کی طرف بلایا تو اس کو بھی عمل کرنے والوں کے برابر اجر ملتا رہے گا اور عمل کرنے والوں کے اجر میں کوئی کمی نہیں ہوگی اور جس کسی نے گمراہی کی طرف بلایا تو اس پر ان عمل کرنے والوں کے برابر سزا ہوگی اور اس گمراہی میں مبتلا افراد کے عذاب اور سزا میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔''

جس طرح زبان دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دینے کے لئے ایک مؤثر وسیلہ ہے

اسی طرح قلم اس دعوت و تبلیغ کے لئے ایک کامیاب ذریعہ ہے چنانچہ وہ مبلغین جن کو اللہ تعالی نے تحریر پر قدرت عطا فرمائی ہے ان کو چاہئے کہ وہ قلم اور تحریر کو اللہ کے دین کی اشاعت کے لئے زیادہ سے زیادہ استعمال کریں اور اہم موضوعات پر قلم اٹھائیں اور ان کی اشاعت رسائل اور مجلات کے ذریعہ کریں۔

خطیب اور امام کا فرق:

خطیب کا اصل کام لوگوں میں تبلیغ دین ہے خواہ وہ خطبات جمعہ کی صورت میں ہو، درس قرآن و حدیث کی صورت میں ہو، محافل ذکر و سیرت کی شکل میں ہو یا کسی اور انداز میں۔ ایک خطیب کا فرض یہ ہے کہ وہ ہمہ وقت لوگوں کی اصلاح کی کوشش میں لگا رہے اور انہیں دین کی معلومات بہم پہنچانے اور ان کا خدا سے رشتہ جوڑنے کی سرتوڑ کوشش کرتا رہے ہاں البتہ اسے اس کام میں حکمت و موعظت کے انداز سے کام لینے کی ازحد ضرورت ہے۔ خطیب، اپنے علاقہ محلّہ یا گاؤں کا روحانی پیشوا اور دینی مصلح ہے۔ اس کا کام پیغمبرانہ نوعیت کا ہے جبکہ امام محض نمازوں کی صحت و خوبی سے ادائیگی کا ذمہ دار ہے۔ موجودہ دور میں بہت کم مساجد ایسی ہیں جہاں امام و خطیب الگ الگ ہوں، اکثر مساجد میں امام ہی خطیب ہوتا ہے۔

ترقی یافتہ خطیب:

آج کے دور میں بعض مساجد میں رواج عام ہو چلا ہے کہ جب وہاں کا خطیب مسجد چھوڑ کر چلا جاتا ہے تو امام یا نائب امام یا مؤذن کو خطبہ جمعہ کے لئے تیار کیا جاتا ہے اور یہ کام عموماً مسجد کمیٹی والے کرتے ہیں۔ امام یا نائب امام و مؤذن چونکہ عموماً کسی دینی مدرسہ کا فارغ التحصیل اور دینی علوم سے واقف نہیں ہوتا اس لئے وہ بازار سے تقریروں کی کتاب خرید لاتا ہے اور پھر اس میں سے حسب موقع کوئی تقریر رٹ کر سنا دیتا ہے۔ ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ کتاب سے دیکھ کر خطیب نے تقریر کی اور کتاب سے دیکھ کر خطبہ دیا۔ اس طرح کے خطیب ترقی یافتہ خطیب ہوتے ہیں اور جب انہیں تقریر کا ملکہ ہو جاتا ہے تو وہ اس مسجد کی تلاش میں نکلتے ہیں جہاں ان کا تقرر بحیثیت مؤذن و نائب امام کے نہیں بلکہ امام و خطیب کے ہو سکے اور چونکہ تقرر کرنے والی اتھارٹی (مسجد کمیٹی) عموماً جہلاء پر مشتمل ہوتی ہے اس

لئے وہ انٹرویو میں لچھے دار تقریر سن کر حضرت کو علامہ تسلیم کر لیتی ہے اور یوں خود ساختہ و ترقی یافتہ خطباء و علماء کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس شہر کراچی میں ایسے خطباء و مبلغین بھی ہیں کہ جن کی جوانی خرمستیوں اور رنگ رلیوں میں گزری، کبھی کسی مدرسہ کا رخ نہیں کیا نہ کہیں سے دینی تعلیم و تربیت لی مگر سسر یا باپ کی نفع بخش مسند سنبھالنے کے لئے سسر یا باپ کے انتقال پر ڈاڑھی بڑھا کر عمامہ و جبہ زیب تن کر کے اپنے سسر یا باپ کے جانشین ہوئے اور علامۃ الدھر بن بیٹھے۔

خطیب و امام کا تعین و تقرر کون کرے؟

کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایک عام ملازم مثلاً باورچی، ڈرائیور، کلرک وغیرہ کا تقرر کرنے کے لئے تحقیق کا تو باقاعدہ اہتمام ہو مگر امام و خطیب کے تقرر میں اس قدر بے احتیاطی کہ محلے یا مسجد کمیٹی کے وہ لوگ ایک عالم کا تقرر کرنے کے اہل قرار پائیں، جن کا علم سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو۔ عموماً مساجد کمیٹیوں کے چیئرمین محلے کے ایسے افراد ہوتے ہیں جو یا تو بہت مالدار اور کاروباری ہوں یا سوشل اور رفاہی کاموں میں پیش پیش رہنے والے فارغ قسم کے جہلاء۔ اس قسم کے لوگوں کو ایک عالم کا انٹرویو لینے کا اختیار قطعی نہیں یہ بڑا ظلم اور زیادتی ہے کہ وہ لوگ جنہیں آنے والے عالم و مبلغ سے دین سیکھنا ہے وہی اس کا انٹرویو لیں اور یہ جاننے کی کوشش کریں کہ یہ صحیح مبلغ اور کامل عالم ہے یا نہیں۔ کیا کبھی کسی شاگرد نے کسی استاذ کا انٹرویو لیا کہ اس کی لیاقت و قابلیت کیا ہے اور پھر اس کے پاس پڑھنا شروع کیا؟

انٹرویو لینے کیلئے مسجد کمیٹی کو چاہئے کہ وہ کسی اچھے عالم کے سامنے امیدوار کو پیش کریں اور انہی سے انٹرویو کروائیں یا اس کی اسناد کو دیکھ کر اس کا تقرر کرلیں اگرچہ محض اسناد پر بھروسہ کرنا کبھی کبھی درست ثابت نہیں بھی ہوتا۔ کیونکہ جس طرح کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیمی اسناد کا کاروبار آج کل کھلے عام ہو رہا ہے اور میٹرک سے پی ایچ ڈی تک کی اسناد جعلی واصلی فراہم کرنے والے ادارے اور گروہ سرگرم عمل ہیں اسی طرح بعض دینی مدارس کی اسناد بھی تبرکاً اور قیمتاً مل جاتی ہیں۔ چنانچہ مساجد میں آئمہ و خطباء کے تقرر کے وقت اسناد کے ساتھ ساتھ حقیقی اہلیت جانچنے کیلئے کسی بڑے عالم سے رجوع کرنا مفید ہے۔

امام کے تقرر کے وقت مسجد کمیٹی بہت سی احتیاطیں پیش نظر رکھتی ہے۔ ان میں سے بعض کا ذکر ضمناً گزشتہ صفحات میں ہو چکا۔ مگر ایک احتیاط جو میرے علم میں نہیں تھی اور اس کتاب کی ترتیب کے دوران ہمارے ایک ایسے کرم فرمانے بتائی جو خود بھی ایک مسجد کمیٹی کے رکن ہیں وہ یہ کہ پڑھے لکھے لوگ اگر مسجد کمیٹی کے رکن ہوں تو ان کے سامنے ایک احتیاط یہ بھی ہوتی ہے کہ امام ان سے کم پڑھا لکھا اور کم گو ہو، اس کی شخصیت بھی زیادہ رعب دار نہ ہو، اور وہ کوئی سکہ بند قسم کا عالم تو کسی صورت نہ ہو، ورنہ وہ کمیٹی والوں پر حاوی ہو جائے گا اور کمیٹی والوں کو اس کے تابع ہو کر اس کی ہر بات تسلیم کرنا پڑے گی۔

عالم اور قصہ گو میں فرق کرنا چاہئے:

بعض آئمہ مساجد واقعی عالم ہوتے ہیں اور بعض صرف قصہ گو، علم کی اپنی ایک شان ہے مگر قصہ گوئی بھی بری نہیں، امام احمد بن حنبل کا قول ہے کہ قصہ گو تو وہ ہیں جو دوزخ اور بہشت کا ذکر کرتے ہیں لوگوں کو ڈراتے ہیں، نیت ان کی خالص ہوتی ہے اور وہ سچے واقعات پیش کرتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے واقعات گھڑ رکھے ہیں اور جھوٹی احادیث وضع کر رکھی ہیں تو میں انہیں اچھا نہیں سمجھتا (القصاص والمذکرین، ابن جوزی) عبرت پذیری کے لئے قصہ گوئی کا حکم قرآن سے ثابت ہے:

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ (الاعراف، آیت ۱۷۶)
یعنی آپ (اے نبیؐ) ان سے حکایت بیان کیجئے تاکہ یہ لوگ اس سے نصیحت حاصل کریں۔

اور بسا اوقات تمثیل کے لئے بھی قصہ بیان کرنے کی ضرورت ہوتی ہے پھر بعض لوگ قصوں سے ایسا درس حاصل کرتے ہیں کہ ان میں خشوع وخضوع اور اللہ کی طرف رجوع کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی لئے علامہ عبدالرحمٰن ابن الجوزی نے لکھا ہے کہ "جملہ علماء کرام اپنے علم وفتویٰ کے ذریعہ لوگوں کو وعظ ونصیحت کیا کرتے تھے مگر ان قصہ گو حضرات اور واعظوں نے اس فرض کو عوام سے خطاب کی صورت بخشی۔ بسا اوقات عوام کو کسی بڑے عالم سے وہ فائدہ نہیں پہنچتا جو ان واعظوں سے پہنچتا ہے۔ (القصاص والمذکرین)

اس طرح تبلیغ کے میدان میں تین طرح کے لوگ ہیں:

○ علماء ربانیین، ○ واعظین، ○ قصہ گو حضرات۔

عوام کو ان تینوں کا فرق جاننا اور سمجھنا چاہئے، نہ ہر واعظ عالم ہے نہ ہر قصہ گو عالم، بلکہ "عالم کا جہاں اور ہے واعظ کا جہاں اور" کوئی شخص بہت اچھا مقرر ہو سکتا ہے مگر ضروری نہیں کہ وہ اتنا ہی اچھا عالم بھی ہو، کیونکہ تقریر و وعظ ایک فن ہے جو کبھی کسی عالم کے پاس بھی ہو سکتا ہے اور غیر عالم کے پاس بھی۔

اب لوگ غیر عالم واعظوں اور قصہ بیان کرنے والوں کا وعظ اور تقریر سنتے ہیں اور اس میں انہیں کوئی بات خلافِ واقعہ یا بعید از قیاس یا دور تر از علم محسوس ہوتی ہے تو اسے علماء کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ قصہ گو کی بات کی ذمہ داری اسی پر ہے نہ کہ عالم پر۔ کسی قصہ گو کی جہالت پر مبنی بات کو علماء سے منسوب کر کے اہل علم کی بے توقیری کسی صورت روا نہیں۔

بعض قصہ گو بڑے عجیب و غریب واقعات بیان کرتے ہیں اور عوام سے داد بھی پاتے ہیں ایسے ہی واقعات میں سے ایک وہ ہے جسے علامہ عبدالرحمٰن ابن جوزی نے القصاص والمذکرین میں نقل کیا ہے، فرماتے ہیں:

"جعفر بن محمد الطیالسی سے روایت ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ اور امام یحییٰ بن معینؒ نے مسجد رصافہ میں نماز پڑھی وہاں ایک واعظ نے کھڑے ہو کر وعظ کہنا شروع کیا اور کہا۔ "ہم سے احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین نے روایت بیان کی۔ ان دونوں نے عبدالرزاق اور عبدالرزاق نے معمر اور معمر نے قتادہ اور قتادہ نے انس سے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس شخص نے لا الہ الا اللہ کہا، اللہ تعالیٰ اس کے لئے ہر کلمہ سے ایک پرندہ پیدا کرے گا جس کی چونچ سونے کی اور پر مرجان کے ہوں گے۔" وغیرہ وغیرہ......

(اس قصہ گو نے اتنا طویل قصہ گھڑ کر سنایا کہ جو شاید بیس اوراق پر

مشتمل ہو) اب احمد بن حنبل یحییٰ بن معین کی طرف دیکھتے تھے اور یحییٰ بن معین، احمد بن حنبل کی طرف اور ایک دوسرے سے پوچھتے تھے کہ کیا آپ نے اس شخص سے یہ حدیث بیان کی ہے؟ اور پھر جواب میں ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ بخدا میں نے تو ابھی (اس کی زبانی) سنی ہے اس سے پہلے کبھی نہ سنی نہ بیان کی۔ پھر دونوں بزرگ خاموش بیٹھے رہے حتیٰ کہ واعظ اپنے وعظ سے فارغ ہو گیا۔ اس کے بعد واعظ نے لوگوں سے عطیات وصول کئے اور پھر بیٹھ کر مزید عطیات اور نذرانوں کا انتظار کرنے لگا۔ اب یحییٰ بن معین نے ہاتھ کے اشارہ سے اسے اپنے پاس بلایا اور وہ اسی خیال سے چلا آیا کہ شاید یہاں سے بھی کچھ انعام ملے گا۔ یحییٰ بن معین نے اس سے کہا یہ حدیث جو آپ نے سنائی ہے یہ آپ نے کس سے سنی ہے؟ اس نے کہا یحییٰ بن معین اور احمد بن حنبل سے۔ یحییٰ بن معین نے فرمایا دیکھو میں یحییٰ بن معین ہوں اور میرے ساتھ احمد بن حنبل ہیں۔ ہم نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں سے یہ حدیث کبھی نہیں سنی اور اگر یہ روایت ہے بھی تو جھوٹ ہے جو کسی نے گھڑی ہو گی۔

اس واعظ نے کہا ''تم ہی یحییٰ بن مَعین ہو؟ انہوں نے فرمایا ''ہاں'' واعظ کہنے لگا میں نے سنا تھا کہ یحییٰ بن معین احمق ہے مگر آج میں نے خود دیکھ لیا کہ یہ بات درست ہے۔ یحییٰ بن معین نے کہا ''تمہیں کیسے اندازہ ہوا کہ میں احمق ہوں، اس نے کہا مجھے اس طرح معلوم ہوا کہ تمہارے خیال میں تم دونوں کے علاوہ دنیا بھر میں کوئی اور یحییٰ بن معین اور احمد بن حنبل نہیں ہیں۔ حالانکہ میں نے سترہ احمد بن حنبل اور سترہ یحییٰ بن معین سے روایات نقل کی ہیں۔ اس پر احمد بن حنبل نے اپنی آستین سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور فرمایا اسے جانے دو''

چنانچہ وہ واعظ اس انداز سے اٹھ کر چلا جیسے ان دونوں کا مذاق اڑاتا جارہا ہو۔'' (القصاص والمذکرین)

اس طرح کا ایک اور دلچسپ واقعہ بھی علامہ ابن الجوزی نے لکھا ہے وہ فرماتے ہیں:

''خلیفہ عبدالملک کے پاس شام کے سرکردہ حضرات بیٹھے تھے کہ خلیفہ نے پوچھا۔ ''اہل عراق میں سب سے بڑا عالم کون ہے؟'' انہوں نے کہا۔ ''عامر شعبیؒ سے بڑھ کر کوئی بڑا عالم نہیں ہے۔'' چنانچہ خلیفہ نے مجھے رقعہ لکھ کر بلوا بھیجا۔ میں (کوفہ سے) روانہ ہو گیا۔ راستے میں تدمر نامی بستی میں مجھے ٹھہرنا پڑا تو اتفاق سے وہ جمعہ کا دن تھا۔ میں (جمعہ کی) نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک دراز ریش بزرگ ایک جانب تشریف فرما ہیں، لوگوں نے ان کے ارد گرد حلقہ بنا رکھا ہے۔ وہ ان سے (سن کر) احادیث لکھ رہے ہیں ان بزرگ نے ایک حدیث ان لوگوں کو یوں سنائی کہ ''مجھ سے فلاں نے فلاں سے روایت کی (اس طرح اس شیخ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک روایت پہنچائی) کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے دو صور پیدا کیے ہیں۔ ان میں سے ہر صور میں دو مرتبہ پھونکا جائے گا۔ ایک (مخلوق کو) بے ہوش کرنے والا پھونکنا اور دوسرا قیامت والا (قبروں سے اٹھانے والا) شعبیؒ کہتے ہیں۔ ''یہ سن کر میں ضبط نہ کر سکا اور جلدی جلدی نماز ختم کی۔ پھر میں نے کہا ''اے شیخ! خدا سے ڈرو اور غلط روایت بیان نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ نے تو ایک ہی صور پیدا کیا ہے، جو دو دفعہ پھونکا جائے گا۔ ایک (مخلوق کو) بے ہوش کرنے کا پھونکنا اور دوسرا نفحہ قیامت (قبروں سے اٹھانے والا)'' اس شیخ نے کہا ''او فاسق و فاجر! مجھے فلاں راوی نے فلاں راوی سے یہ حدیث بیان کی ہے اور تو میری تردید کر رہا ہے۔'' پھر اس نے جوتا اٹھا کر مجھے دے

مارا۔ بس پھر کیا تھا لوگوں نے بھی اس کی دیکھا دیکھی مجھے پیٹنا شروع کر دیا۔ خدا کی قسم! انہوں نے مارتے مارتے مجھے اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک کہ میں نے یہ حلفیہ اقرار نہ کر لیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمیں صور بنائے ہیں اور ہر صور میں ایک ایک بار پھونکا جائے گا۔" تب جا کر انہوں نے مجھے چھوڑا میں جب دمشق پہنچا تو خلیفہ کے ہاں حاضر ہو کر سلام کیا۔ خلیفہ عبدالملک نے مجھ سے کہا شعبی! اس سفر میں جو تم نے سب سے عجیب چیز دیکھی ہو یا دلچسپ واقعہ پیش آیا ہو وہ سناؤ۔" میں نے خلیفہ کو تدمر والا واقعہ سنایا جو مجھے پیش آیا تھا۔ یہ واقعہ سن کر خلیفہ بہت محظوظ ہوا اور ہنستے ہنستے اس کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ وہ ہنستا جاتا تھا اور زمین پر بے اختیار پاؤں مارتا جاتا تھا۔"

مندرجہ بالا دو واقعات سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قصہ گو حضرات میں کس قدر نامی گرامی اور جری قسم کے لوگ ہو گزرے ہیں۔ چنانچہ امام مسجد کے تقرر کے وقت یہ بات بھی پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ کسی عالم کے میسر نہ ہونے کی صورت میں کسی قصہ گو یا نرے واعظ کا تقرر نہ کیا جائے۔ نیز عوام و خواص کو چاہئے کہ وہ عالم، واعظ اور قصہ گو کے فرق کو مد نظر رکھتے ہوئے ہی انگشت نمائی فرمائیں اور سبھی کو ایک لاٹھی سے ہانکنے کی عادت ترک کریں۔

کیا ہم یہاں ضمناً یہ بات پوچھنے کی جسارت کر سکتے ہیں کہ ڈاکٹروں کے سلسلہ میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا سبھی ڈاکٹر ایک جیسے ہوتے ہیں اور کیا ہر ڈاکٹر کا بورڈ لگا کر بیٹھنے والا شخص ڈاکٹر ہے؟ کیا ان میں بھی ایسے لوگ نہیں ہوتے جو محض نام کے ڈاکٹر ہوتے ہیں اور کتنے ہی ایسے ڈاکٹر ہیں کہ جن کی نظر مریض کے صحت یاب ہونے پر نہیں۔ اپنے کلینک کے بل پر ہے اور وہ مریض کو اس وقت تک فارغ نہیں کرتے جب تک اس کی رگوں میں جان اور جیب میں پیسہ ہے کیا آپ نے خون فروش اور اعضا فروش بلکہ اطفال فروش قسم کے ڈاکٹر نہیں سنے؟ مگر اس کے باوجود عمومی طور پر ڈاکٹروں کو "قصاب" کا خطاب نہیں دیا جاتا، ڈاکٹر ہی کہا جاتا ہے جبکہ دوسری طرف صورتحال یہ ہے کہ اگر کسی ایک دین داری کا لیبل رکھنے والے سے بدظن ہوئے تو سب علماء ہی کو نظروں سے گرا دیا۔

علماء کی بے توقیری کیوں؟

علماء کی بے توقیری کے اسباب پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا حافظ محمد سعد اللہ صاحب مدیر منہاج لاہور لکھتے ہیں:

''امامت و خطابت اسلام میں بڑا قابل احترام اور رفیع المنزلت منصب ہے۔ کیونکہ اسی منصب سے تعلیم و تربیت ایمان و دین کا فروغ اور استحکام وابستہ ہے۔ ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کی بے دینی، بے غیرتی، عیاشی، نااہلی، بزدلی، ناعاقبت اندیشی باہمی خانہ جنگی اور بعض لوگوں کی ملت فروشی کے باعث جب انگریزوں کی حکومت قائم ہو گئی تو انہیں سابق حکمرانوں اور امراء کے دوبارہ اٹھنے کا اتنا خوف نہیں تھا جتنا انہیں مسلمانان ہند کی دین داری اسلام پسندی محبت رسول ﷺ اور فطری جذبہ جہاد کے بیدار ہونے کا خطرہ تھا۔ براہ راست اسلام وایمان پر پابندی تو ان کے لئے اس وقت بہت مشکل تھی۔ تاہم مسلمانوں کو اسلام سے دور، بیگانہ، برگشتہ اور لاتعلق کرنے کے لئے اور اللہ و رسول ﷺ کے ساتھ ان کی والہانہ وابستگی کو ختم کرنے کے لئے چالاک دشمن دین نے جہاں بالواسطہ کئی تعلیمی، معاشی، سماجی اور ادعائے نبوت کے ذرائع اختیار کئے وہاں اس نے لوگوں کو علماء دین سے برگشتہ و متنفر کرنے اور معاشرے میں پروقار مقام، باعزت مرتبہ اور قابل رشک حیثیت کو ختم کرنے کے لئے بھی ایک خطرناک منصوبہ بنایا تاکہ ''نہ رہے بانس نہ بجے بانسری'' کے مصداق جب علماء کا وجود اور ان کے ساتھ لوگوں کا قلبی تعلق ختم ہو جائے گا تو نتیجے میں لوگ دین وایمان اور اسلامی اقدار و اخلاق سے دور ہو جائیں گے اور اسلام کے ساتھ ان کی وابستگی بالکل ختم نہ سہی کم از کم کمزور تو ضرور پڑ جائے گی۔ ان کے نام تو مسلمانوں والے ہوں گے مگر ان کے ذہن و افکار اور عادات و اطوار غیر اسلامی ہوں گے۔

علماء حق کی ثابت قدمی:

اس منصوبہ اور پالیسی کے تحت انگریز دور میں علماء دین کو تشدد اور تضحیک کا نشانہ بنایا گیا۔ ہر قسم کی سرکاری مراعات سے محروم کر دیا گیا۔ ''ملا'' کے لفظ کو جو کبھی انتہائی علم و فضل کی علامت سمجھا جاتا تھا (جیسے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی'' وغیرہ) علماء کے نام کے ساتھ بطور استہزاء اور تذلیل بولا جانے لگا۔ ان کی دستار فضیلت کو ''بیروں'' اردلیوں اور عدالتی پر کاروں کے سر پر رکھ دیا گیا۔ علماء دین کو سرکاری محکموں اور ملازمتوں سے دیس نکالا دے دیا گیا۔ ان کی معاشرتی حیثیت کو ختم کر دیا گیا وغیرہ وغیرہ۔ اس کے باوجود علماء حق نے حکومتی مخالفت، طاغوتی ہتھکنڈوں، سازشوں، کھلم کھلا طعن و تشنیع، استہزاء، تضحیک، تنگی ترشی اور بے سروسامانی کے باوجود بڑی ثابت قدمی، مضبوطی اور استقلال کے ساتھ اللہ و رسول ﷺ کے دامن کو تھامے رکھا، مساجد و مدارس میں چٹائیوں پر بیٹھ کر مسلمانان ہند کو دین و ایمان اور کتاب و سنت کی تعلیم دیتے اور قال اللہ و قال الرسول کے ذریعے دین کی آبیاری کرتے رہے۔ مخالفت کی پرزور آندھیوں میں بھی انہوں نے شمع دین کو جلائے رکھا۔

اپنی سازش میں انگریز کی کامیابی:

تاہم انگریز کا یہ ''علماء کش منصوبہ'' نرا ناکام بھی نہیں رہا وہ اپنی مکروہ سازش میں کافی حد تک کامیاب رہا۔ علماء دین کے خلاف اس نے لوگوں کے اذہان میں نفرت اور تذلیل و تحقیر کا جو زہر آلود بیج بویا تھا وہ ان کے چلے جانے کے باوجود آج خاصا تناور درخت بن چکا ہے۔ دین کے ساتھ اگرچہ برائے نام اور رسمی و واجبی سا ہمارا تعلق ضرور ہے مگر علم دین اور کتاب و سنت کی تعلیمات سے من حیث القوم ہم دور چلے گئے ہیں۔ علم دین آج ہماری ضرورت ہی نہیں رہا۔ انگریز کی پالیسی کے مطابق قیام پاکستان کے بعد بھی آج تک کسی حکومت نے علم دین کی حکومتی سطح پر سرپرستی نہیں کی۔ نہ ہی علم دین پڑھنے والوں کے لئے حکومتی اداروں میں کوئی منصب ہے جس کے نتیجے میں فطری طور پر لوگوں نے علم دین کو بالکل پس پشت ڈال دیا ہے۔ علماء دین کا معاشرے میں چونکہ کوئی حقیقی مقام نہیں اس لئے جو لوگ مدارس میں علم دین اور قرآن و حدیث پڑھتے ہیں وہ بھی (الا ماشاء اللہ) بس اتنا ہی پڑھتے ہیں جس سے کسی مسجد کی امامت و خطابت کر سکیں۔ (ہفت روزہ تسخیر، ستمبر ۱۹۹۶ء)

مساجد کمیٹیوں کی ہیئت ترکیبی

جیسا کہ ابھی ہم نے کہا کہ مسجد کمیٹیاں عموماً اہل محلہ کے کھاتے پیتے یا رفاہی خدمت گاروں پر مشتمل ہوتی ہیں اور ان میں پڑھے لکھے اور حقیقی دین دار لوگ کم ہوتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسے لوگوں کو مسجد کمیٹی کے اراکین وعہدیداران میں شامل کیا جائے جو خود بھی دینی سوجھ بوجھ رکھتے ہوں اور تقویٰ وطہارت کے مالک ہوں، بسا اوقات آئمہ اور مسجد کمیٹی کے اراکین کے مابین تلخی اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ بات کرنے کا انداز نہایت گھٹیا ہو جاتا ہے۔ مگر ایسا وہیں ہوتا ہے جہاں اراکین کمیٹی جاہل اور بے دین ہوں یا امام وخطیب کی علمی حیثیت ''ترقی یافتہ'' قسم کی ہو۔ کوئی بھی پڑھا لکھا اور عالم گفتگو میں گراوٹ کا مظاہرہ نہیں کرسکتا۔ مگر اس طرح کی شکایات اب عام ہیں کہ جب امام مسجد سے اختلاف ہوا فوراً سفلی درجہ کی تو تڑاخ پر آ گئے اور آناً فاناً یہ بھول گئے کہ ہم نے اس شخص کی متعدد نمازوں میں اقتداء کی ہے اس سے دین کے مسائل سیکھے اور سنے ہیں اور یہ کہ وہ ایک عالم دین یا امام ہے۔

کیا امام فرشتہ ہے؟

لوگوں کا خیال امام وخطیب کے بارے میں یہ ہوتا ہے کہ بس وہ بالکل فرشتہ صفت

ہے اس سے کسی قسم کی لغزش، غلطی، بھول چوک اور گناہ کا کام سرزد ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر ایسا ہو گیا تو وہ امام وعالم نہیں آخر کیوں؟ کیا وہ کوئی فرشتہ ہے جو اس سے کوئی غلطی کوئی گناہ اور کوئی لغزش نہیں ہو سکتی۔ وہ بھی ایک انسان ہے ہاں البتہ دوسروں کی بہ نسبت اس سے کم گناہ سرزد ہونے کا امکان ہے بشرطیکہ وہ عالم ومتقی ہو اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جو عالم ومتقی ہو اس سے سرے سے کوئی گناہ کا کام ہونا محال ہے۔ حضرت علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد الطالبین میں لکھا ہے کہ قطبِ وقت سے بھی زنا کا صدور ممکن ہے (اَلْقُطْبُ قَدْ یَزْنِیْ) اور یہ بات سمجھ میں بھی آتی ہے کیوں کہ کوئی ولی، قطب، غوث کتنے بھی مرتبہ کا ہو صحابی کے درجہ کو پھر بھی نہیں پہنچ سکتا اور جب صحابہ میں سے بعض سے گناہوں کے سرزد ہونے کی روایات صحیحہ موجود ہیں تو پھر کسی اور سے گناہ کا سرزد ہونا غیر معمولی کیوں ہوگا؟ کیا حضرت ماعز اسلمی صحابی نہیں تھے جن کو اعتراف زنا کرنے پر کوڑے لگائے گئے؟

خرابی کی جڑ:

ساری خرابی کی جڑ یہ ہے کہ ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ امام وخطیب فرشتے ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان سے کسی قسم کی لغزش کا امکان ہی نہیں۔ یہ تصور نہایت غلط ہے اس تصور کا نتیجہ یہ ہے کہ جب بھی کسی مؤذن، خادم، معلمِ اطفال وغیرہ سے کوئی بے احتیاطی ہو جاتی ہے تو یہ ایک اخباری مسئلہ بن جاتا ہے کہ دیکھو دیکھو مولوی ہو کر یہ کام کر ڈالا۔ اللہ کے بندو! کیا دینی خدمت گار کو آپ نے مقطوع الذکر، فانی الشہوۃ میت النفس سمجھ رکھا ہے اس کے ساتھ بھی وہی فطری بشری تقاضے ہیں جو کسی عام انسان کے ساتھ، اور پھر اس کے بھٹکنے کا امکان اس لئے بھی زیادہ ہے کہ اس کے ساتھ عام انسانوں کی بہ نسبت ذرا بڑا سا شیطان ہوتا ہے۔ کیونکہ شیطان یہ چاہتا ہے کہ لوگوں کو نیکی سے روکے اور برائی و بے حیائی کی طرف لے جائے عام آدمی کو شیطان کا معمولی سا کمزور سا چیلہ مسجد نہیں جانے دیتا اور زنا کاری پر آمادہ کر لیتا ہے مگر مولوی کو گناہ پر آمادہ کرنے اور نیکی سے برگشتہ کرنے کے لئے زیادہ زور آزمائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ چنانچہ اس کے ساتھ ابلیس اپنا کوئی طاقت ور چیلہ لگاتا ہے جبھی تو

دوسروں کی بہ نسبت مولوی سے گناہوں کا صدور کم ہوتا ہے کہ وہ اپنے علم وتقویٰ کی بناء پر خوب مقابلہ کرتا ہے مگر جب کبھی بے بس ہو جاتا ہے اور اس کے جال میں پھنس جاتا ہے تو پھر برائی کا مرتکب ہوتا ہے۔

لہٰذا امام وخطیب سے یہ توقع رکھنا کہ بس وہ فرشتہ ہے، نہایت غلط ہے بلکہ یہ سمجھ کر ہی امام کو امام اور خطیب کو خطیب مقرر کرنا چاہئے کہ اس کی نیکیاں انشاء اللہ ہم سے زیادہ اور برائیاں کم تر ہوں گی اور اصول بھی یہ ہے کہ جس شخص میں اچھائیاں زیادہ ہوں اس کی برائیوں سے صرف نظر کیا جائے۔

ننانوے فیصد الزام غلط:

ہم یہ بات پہلے کہہ چکے ہیں کہ امام کو انسان تصور کرتے ہوئے اس سے انسانی افعال کے صدور کی توقع رکھنی چاہیے، ملکوتی افعال کی نہیں۔ بسااوقات اس طرح کے واقعات سننے میں آتے ہیں جن میں کسی امام یا مدرس یا معلم اطفال وغیرہ سے کسی غیر اخلاقی حرکت کے صادر ہونے کا افسوس ناک پہلو موجود ہوتا ہے۔ ایسا ہونا ممکن ہے اور موجودہ دور کے امام یا عالم سے کچھ غیر اخلاقی معاملات صادر ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ دور بہر کیف شیطنت کے غلبہ کا دور ہے، خیر کے غلبہ کا نہیں، آپ ذرا اس زمانے پر نظر ڈالیے جسے ''خیر القرون'' کہا گیا اور جس میں خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بحیات ظاہری موجود تھے۔ کیا ماعز اسلمی کا واقعہ اس دور میں پیش نہیں آیا؟ اور صحابی کو جرم زنا میں رجم نہیں کیا گیا؟

تمام علماء مل کر بھی ایک صحابی کے برابر نہیں ہو سکتے تو پھر کسی ہیجانی جذبات سے مغلوب شخص کے کسی فطری مگر غیر شرعی امر پر اس قدر چراغ پا ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ کہ اسے اخباری و اشتہاری معاملہ بنا دیا جائے۔ کیا عہد رسالت میں بھی ایسے کسی واقعہ کو اس طرح اچھالا گیا جس طرح آج ہو رہا ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ ایسے کسی بڑے جرم کے مرتکب کو برے کلمات سے یاد تک نہیں کیا گیا اور نہ اس کی اجازت دی گئی۔ صحیح مسلم کی روایت ہے:

''ایک غامدیہ عورت نے زنا کا ارتکاب کیا اور اسے سنگسار کیا

گیا حضرت خالد بن ولید بھی سنگسار کرنے یعنی پتھر مارنے والوں میں
شامل تھے اس عورت کو پتھر لگنے سے اس کے بدن سے خون کی کچھ
چھینٹیں اس طرح خالد بن ولید کے چہرے پر پڑیں کہ ان کا چہرہ لتھڑ
گیا اور انہوں نے اس خاتون کے لئے کوئی برا کلمہ کہا جسے رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے سن لیا اور آپ نے فرمایا اے خالد! ایسا نہ کہو۔"

دیکھیے .... (صحیح مسلم، کتاب الحدود)

فی زمانہ اس قسم کے واقعات کثرت سے ہو رہے ہیں مگر عوام میں نہ کہ علماء و آئمہ مساجد میں، اسکول، کالج، اسپتال، یونیورسٹیاں اور کارخانے جہاں مخلوط نظام تعلیم و عمل ہے اس قسم کے واقعات کی آماجگاہیں ہیں، مگر کوئی انہیں برا کہتا ہے نہ ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔ مگر مسجد و مدرسہ کے حوالہ سے پیش آنے والے اکا دکا واقعات کو اس طرح ہوا دی جاتی ہے کہ قوم ان اداروں سے منسلک لوگوں سے نفرت کرنے لگے اور انہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم اس قسم کے واقعات کی حوصلہ افزائی کے خواہاں ہیں یا ان کو برا نہیں سمجھتے۔ یقیناً اس طرح کا کوئی بھی عمل کسی سے بھی سرزد ہو قابل مذمت ہے مگر اس سے شرعی طریقہ سے نمٹا جائے نہ کہ عوامی و سطحی انداز سے۔

مانا کہ دین دار طبقہ کو انتہائی ہوشیار رہنے اور اپنا دامن ہر طرح کی آلودگیوں سے پاک رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے مگر اس کا کیا کیا جائے کہ جب مسجد کمیٹی یا محلہ والے کسی ذاتی رنجش کا بدلہ امام یا مؤذن و معلم سے لینا چاہیں تو اس پر اسی قسم کا الزام عائد کر دیتے ہیں۔

تحقیقی سروے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ آئمہ مساجد و خطباء پر اخلاقی اعتبار سے لگنے والے الزامات میں سے ۹۹ فیصد غلط ہوتے ہیں، متعدد واقعات ہماری نظروں کے سامنے ہیں، جن میں امام و خطیب پر بدکاری کا الزام لگوایا گیا مگر وہی جس کو مفعول بنا کر پیش کیا گیا تھا اس نے عدالتی شہادت و گواہی کے وقت امام کے پاؤں پکڑ کر کہا مجھے معاف کیجئے میں نے آپ پر غلط الزام فلاں شخص کے اکسانے پر لگایا۔

ائمہ اور علماء پر تہمت لگنے کے واقعات نئی بات نہیں، اہل کتاب کے روشن دماغوں

اور مذہب دشمنوں نے تو انبیاء تک کو نہیں بخشا اور ایسے بھونڈے الزامات ان پر عائد کئے (جو ان کی کتابوں میں آج بھی موجود ہیں) کہ جن کے مطالعہ سے روح کانپ اٹھتی ہے۔

بائبل (عہد نامہ قدیم) کی کتاب سلاطین کے باب ۱۱ کا آغاز اس طرح ہو رہا ہے۔

''اور سلیمان بادشاہ فرعون کی بیٹی کے علاوہ بہت سی اجنبی عورتوں سے یعنی موآبی، عمونی، ادومی، صیدانی اور حتی کہ عورتوں سے محبت کرنے لگا۔ سلیمان انہیں کے عشق کا دم بھرنے لگا'' (۳۴)

گویا بائبل کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام جیسا اولوالعزم پیغمبر مبتلائے عشق زناں ہوا (معاذ اللہ) اس سے بڑا الزام کسی پیغمبر پر کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن اہل کتاب نے اسی پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ بعض انبیاء پر اعلانیہ زنا کی تہمت بھی عائد کی۔ حضرت لوط علیہ السلام پر الزام تراشی کرتے ہوئے بائبل کی کتاب پیدائش میں حضرت لوط علیہ السلام پر تہمت زنا ان الفاظ کے ساتھ مذکور ہے۔ (نقل کفر کفر نہ باشد)

''اور لوط ضغر سے نکل کر پہاڑ پر جا بسا اور اس کی دونوں بیٹیاں اس کے ساتھ تھیں، کیونکہ اسے ضغر میں بستے ڈر لگا اور وہ اور اس کی دونوں بیٹیاں ایک غار میں رہنے لگے تب پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ ہمارا باپ بوڑھا ہے اور زمین پر کوئی مرد نہیں جو دنیا کے دستور کے مطابق ہمارے پاس آئے آؤ ہم اپنے باپ کو مے پلائیں اور اس سے ہم آغوش ہوں، تاکہ اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں۔ سو انہوں نے اسی رات اپنے باپ کو مے پلائی اور پہلوٹھی اندر گئی اور اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی پر اس نے نہ جانا کہ وہ کب لیٹی اور کب اٹھ گئی اور دوسرے روز یوں ہوا کہ پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ دیکھ کل رات کو میں اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی آؤ آج رات بھی اس کو مے پلائیں اور تو بھی جا کر اس سے ہم آغوش ہو تاکہ ہم اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں سو اس رات بھی انہوں نے اپنے باپ کو مے پلائی اور

چھوٹی گئی اور اس سے ہم آغوش ہوئی پر اس نے نہ جانا کہ کب وہ لیٹی اور کب اٹھ گئی۔ سو لوط کی دونوں بیٹیاں اپنے باپ سے حاملہ ہوئیں اور بڑی کے ایک بیٹا ہوا اور اس کا نام موآب رکھا، وہی موآبیوں کا باپ ہے جو اب تک موجود ہیں اور چھوٹی کے بھی ایک بیٹا ہوا اور اس نے اس کا نام بن عمی رکھا وہی بنی عمون کا باپ ہے جو آج تک موجود ہیں (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) (۳۵)

اس طرح عیسائی دانشوروں نے اللہ کے ایک پاک پیغمبر پر تہمت لگانے کی ناپاک جسارت کی اور صرف یہی نہیں انہوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے بڑے بیٹے پر الزام لگایا کہ اس نے اپنے باپ کی بیوی سے زنا کیا اور باپ نے اسے کچھ نہ کہا۔

بائبل کی کتاب پیدائش باب ۳۵ میں ہے۔

''روبن نے جا کر اپنے باپ کی حرم بلہاہ سے مباشرت کی اور اسرائیل کو یہ معلوم ہو گیا۔'' (۳۶)

حضرت داؤد علیہ السلام پر بھی تہمت زنا لگائی گئی، سفر سموئیل ثانی باب ۱۱ میں ایک قصہ لکھا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

''حضرت داؤد علیہ السلام ظہر کے بعد اپنے بستر سے اٹھے اور شاہی محل کی چھت پر ٹہلنے لگے اتفاقاً ان کی نگاہ ایک عورت پر پڑی جو غسل کر رہی تھی اور بڑی خوب صورت تھی، داؤد نے کسی آدمی کو بھیج کر اس عورت کی نسبت معلوم کرایا تو لوگوں نے بتایا کہ یہ ''اوریا'' کی بیوی بت سبع ہے۔ پھر داؤد نے آدمیوں کو بھیج کر اس عورت کو پکڑوا لیا اور اس کے ساتھ صحبت کی پھر وہ اپنے گھر واپس چلی گئی اور اسے حمل رہ گیا۔'' (۳۷)

متذکرہ بالا بیانات یہود و نصاریٰ کی مشہور کتابِ مقدس، بائبل میں موجود ہیں۔ قرآن کریم نے ان تمام الزامات سے ان انبیاء کرام کو بری قرار دیتے ہوئے ان کی شان

بیان کی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر لگنے والے الزامات بے بنیاد اور بے اصل ہیں۔

علاوہ ازیں حضرت مریم علیہا السلام پر لگنے والے الزام سے کون واقف نہیں؟ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر لگائی جانے والی تہمت بھی تاریخ اسلام کا ایک حصہ ہے جس کا مقصد براہِ راست نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو نشانہ بنانا تھا۔ مگر اللہ رب العزت نے قرآن کریم میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کی برأت نازل فرما کر معاملے کو صاف کر دیا اور صرف یہی نہیں بلکہ ایک اصول وضع فرما دیا کہ:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًاۢ بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ○ (الحجرات، آیت ۶)

یعنی اے اہل ایمان! اگر کوئی فاسق شخص تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو تحقیق کر لیا کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر اپنے کیئے پر پشیمان ہو۔

مسلمانوں کے ہاں مسلم زعماء اور علماء پر تہمت دھرنے کی وجہ ان کی غیر معمولی شخصیت کو داغدار کرنے اور عوام کو ان سے بدظن کرنے کے علاوہ بعض دنیاوی مفادات کا حصول بھی ہے۔ کبھی کسی عالم پر تہمت اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے حسد کے پیش نظر لگائی جاتی ہے اور کبھی اس سے وہ مقام و منصب چھیننے کی غرض سے جس پر وہ فائز ہو۔ امام مسجد کو کسی مسجد کی امامت سے فارغ کرنے کے لئے مسجد کمیٹی یا علاقہ کے مقیم مخالف گروپ کے افراد اس طرح کے حربے استعمال کرتے رہتے ہیں۔

حضرت امام محمد الغزالی کے بھائی امام احمد الغزالی پر بھی تہمت لگی اور یہ مشہور ہو گیا کہ وہ ایک قصاب کے بچے کے ساتھ اغلام بازی کے مرتکب ہیں مگر اس لڑکے کے باپ نے اصل صورتحال خود معلوم کر کے اطمینان کر لیا اور لڑکا اور اس کا باپ امام احمد کے مرید ہو گئے جبکہ تہمت لگانے والوں کو رسوائی کا منہ دیکھنا پڑا۔ (۳۸)

حضرت شیخ جلال الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ سے سلطان التمش کو بڑی عقیدت

تاریخ سزا سے ایک دن پہلے مواضعات میر ابادیہ و میر اا کو وغیرہ کے مسلمانوں نے اجتماع کر کے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا مگر بڑے پیر صاحب نے اطراف و جوانب میں پیغامبر بھجوا کر اطلاع کرادی کہ جو کوئی ایسا قدم اٹھائے گا اس کا ہمارے ساتھ کوئی تعلق نہ ہوگا چنانچہ لوگ رک گئے۔

سزا والے دن علی الصباح ہی ہزاروں کی تعداد میں مرد و زن قلعے کے باہر جمع ہو گئے اس قلعہ کے کھنڈرات شہر (گولڑا) سے مغرب کی جانب کچھ دور ندی کے کنارے اب تک موجود ہیں۔ عورتوں نے آہ و بکا کرتے ہوئے اپنے زیورات کا ڈھیر لگا دیا کہ ہمارے پیر زادے کو ان کے ساتھ تول کر جرمانہ وصول کر لو اور انہیں رہا کر دو مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی اس زمانے کے دستور کے مطابق عبرت عامہ کے لئے سزائے موت شارع عام پر دی جاتی تھی اس لئے ایک کھلی جگہ لکڑیاں چن کر چتا تیار کی گئی اور فوج نے اسے گھیرے میں لے لیا۔

یہ بدھ یعنی چہار شنبہ کا دن تھا، اس رات اچی صاحب کو حضرت غوث الاعظمؒ کی زیارت نصیب ہوئی جنہوں نے فرمایا کہ چتا پر جانے سے پہلے غسل کر کے، گھر میں جو نیا لباس موجود ہے پہن کر دو نفل نماز ادا کر لینا، چنانچہ سکھ سپاہیوں نے آخری خواہش کی تکمیل میں غسل کے لئے پانی بھی دیا اور گھر سے لباس بھی منگوا دیا جو آپ نے پہن کر نماز دوگانہ ادا فرمائی اور چتا پر جا کر بیٹھ گئے۔ لکڑیوں پر تیل ڈال کر آگ لگانے کی کوشش کی گئی مگر لاکھ جتن کے باوجود آگ نہ لگی یہ دیکھ کر الزام لگانے والے شخص نے کہا کہ سپاہی پیروں سے مل گئے ہیں اس لئے دانستہ ہیرا پھیری کر رہے ہیں، میں دیکھتا ہوں آگ کیسے نہیں لگتی یہ کہہ کر اس نے حضرت کے کپڑوں اور لمبے لمبے گھونگھریالے بالوں پر کافی تیل ڈالا اور ایک برتن میں خشک بنولے ڈال کر جلائے اور جب شعلے بلند ہونے لگے تو اس نے برتن کو آپ کے تیل میں تربتر بالوں کے نیچے رکھ دیا مگر شعلے لپکتے رہے اور ان کی حرکت سے حضرت کے بال لہراتے رہے لیکن انہوں نے آگ کا کوئی اثر قبول نہ کیا۔ آخر اس نے جلتے ہوئے بنولوں کو آپ کے تیل میں شرابور کپڑوں پر الٹ دیا لیکن وہ بغیر کسی قسم کا اثر کئے ہوئے لکڑیوں پر جا گرے اور بجھ گئے۔ یہ دیکھ کر لوگوں میں آپ کی بے گناہی کا غوغا اٹھا اور قلعہ دار نے حکم دیا کہ مخبر کو

گرفتار کر کے اسی چتا پر جلا دیا جائے اور خود گلے میں کپڑا ڈال کر دست بستہ حضرت سے معافی کا خواستگار ہوا کہ آپ واقعی بے گناہ ہیں، میں نے اس برے آدمی کے کہنے میں آ کر آپ پر ناحق ظلم کیا۔

قبلہ عالم حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب ؒ فرماتے تھے کہ اس روز حضرت پیر سید فضل دین صبح سے ہی اپنے حجرے میں بغداد شریف کی طرف منہ کر کے کھڑے تھے اور بار بار آدمی بھیج کر اجی صاحب کی خبر منگواتے تھے جب آپ نے سنا کہ مخبر کو گرفتار کر لیا گیا ہے تو آدمی دوڑایا کہ نذر دین شاہ سے کہو اس شخص کو معاف کر دے لیکن اس شخص کے پہنچنے سے پہلے ہی حضرت اجی صاحب نے سکھ سردار سے کہہ دیا تھا کہ میں اس وقت تک چتا سے نہیں اتروں گا جب تک اس شخص یعنی میرے خلاف الزام لگانے والے کو معافی نہ دے دی جائے گی۔

آناں کہ بجائے مابدی ہا کردند
گردست رسد بجز نکوئی مکنم

''حضرت اجی صاحب کے ان تیل سے بھیگے ہوئے کپڑوں کے ساتھ لوگوں نے غلاف کعبہ کا سا سلوک کیا اور عالم شوق و وارفتگی میں تبرکاً ان کے چیتھڑے کر کے ہمراہ لے گئے۔ خدا کی شان کہ اس واقعہ کے جلد ہی بعد یعنی ۱۸۴۸ء میں سکھوں کی عملداری کا تختہ بھی الٹ گیا اور پنجاب پر انگریزوں کی حکومت ہو گئی۔ اس واقعہ کے بعد تمام عمر حضرت اجی صاحب کا بدھ کی رات کو تہجد کے وقت غسل کا معمول رہا اور آپ اسی کو بطور وظیفہ حل مشکلات بتلایا کرتے تھے۔(۳۹)

الغرض اس طرح کے واقعات متقدمین و متاخرین کے بارے میں ہر دور میں مشہور ہوتے رہے اور اکثر واقعات میں خود تہمت دھرنے والوں نے اعتراف گناہ کیا۔

کچھ عرصہ پہلے کراچی کی ایک مسجد کے امام صاحب جو عمر رسیدہ اور کئی بچوں اور بچیوں کے باپ ہیں، نے یہ واقعہ مجھے سنایا کہ ایک سیاسی گروپ ان کی تقاریر سے خاصا الرجک اور ان کے خیالات سے اختلاف شدید رکھتا ہے اور اس گروپ کے کئی سرغنے اسی محلہ میں رہتے ہیں جس محلہ کی مسجد میں حضرت امام ہیں۔ جب علمی سطح پر اور گفتگو کے ذریعہ یہ

گروپ امام صاحب کو رام نہ کر سکا تو اس نے انتقام لینے کا وہی راستہ اختیار کیا جو ایسے سفلی قسم کے لوگ کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک نوجوان لڑکی ایک روز اچانک امام صاحب کے گھر پر آئی دستک پر امام صاحب نے جیسے ہی دروازہ کھولا تو وہ تعویذ لینے کا بہانہ کر کے جلدی سے کمرے میں داخل ہو گئی اور امام صاحب کو بدکاری کے لئے دعوت دی۔ امام صاحب نے بڑی منت سماجت کی، ہاتھ جوڑے کہ خدا کے غضب کو دعوت مت دو، میں خود بچیوں کا باپ ہوں مگر اس نے اصرار کیا اور آگے بڑھ کر امام صاحب کو پکڑ لیا اور کہا کہ اگر انکار کیا تو ابھی شور مچا دوں گی۔ امام صاحب نے سیاسی تدبر سے کام لیتے ہوئے کہا، تم حسین بھی ہو اور قابل توجہ بھی، تمہاری دعوت کو کون رد کر سکتا ہے مگر اس وقت میرے کچھ مہمان اندر بیٹھے ہیں اور کچھ ابھی آنے والے ہیں جلدی نکل جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ رنگ میں بھنگ ڈال دیں اور کل اسی وقت آنا۔

دوسرے روز امام صاحب نے تمام انتظامات مکمل کئے اور مسجد کے خفیہ گوشوں میں مسلح افراد بٹھا دیے اور کہا کہ جیسے ہی وہ لڑکی اندر داخل ہو تم نگاہ رکھنا اور فوراً پہنچ جانا۔ ایسا ہی کیا گیا اور دوسرے روز جیسے ہی وہ دروازے سے اندر داخل ہوئی ان لوگوں نے اسے پکڑ لیا۔ جیسے ہی اس نے شور مچایا اس کے حواری (جو اسے لائے تھے اور جنہوں نے اسے سکھا کر بھیجا تھا کہ تم جیسے ہی اندر سے آواز دو گی اور شور مچاؤ گی ہم آ کر امام صاحب کو دبوچ لیں گے اور تہمت دھر دیں گے) وہ حجرے کی طرف لپکے اور جونہی اندر آئے یہاں ان کے انتظار میں موجود مسلح افراد جن کے مارنے پر لڑکی نے شور مچایا تھا، نے ان حواریوں کو بھی پکڑ لیا اور سب کو گھیر کر حوالہ پولیس کیا۔ بیانات ہوئے تو لڑکی نے اعتراف کیا کہ یہ لوگ مجھے اتنے معاوضہ کے لالچ میں اس تہمت لگانے کی خاطر دو روز سے لا رہے تھے۔ تحقیقات پر پتہ چلا کہ اس سارے منصوبے کے پیچھے ایک ''اسلامی گروپ'' کا ہاتھ تھا جو امام صاحب کے عقائد و نظریات سے اختلاف رکھتا تھا اور اس طرح انہیں رسوا کر کے مسجد سے نکلوانے کا اس نے منصوبہ بنایا تھا جو ناکام بلکہ الٹا ہو گیا۔

علیٰ ھذا القیاس علماء کرام اور آئمہ مساجد کو بدنام کرنے کی مذموم کوششیں مختلف

انداز میں ہوتی رہتی ہیں، آئمہ مساجد کو چاہئے کہ وہ نہایت چوکنے اور ہوشیار رہیں۔ غیر ملکی اسلام دشمن تنظیمیں (NGO'S) بھی علماء کو بدنام کرنے اور عوام الناس بالخصوص نوجوان طبقہ کو علماء سے بدظن کرنے پر لاکھوں روپے خرچ کرتی ہیں وہ اس مقصد کے لئے صحافیوں، ادیبوں اور شاعروں کو خریدتی ہیں اور ان سے علماء کے خلاف مضامین واشعار لکھواتی ہیں تاکہ لوگوں کے دلوں سے علماء کا احترام اٹھ جائے۔ یہ صورتحال صرف پاکستانی ہی میں نہیں پورے عالم اسلام میں ہے، ریاض سعودی عرب سے شائع ہونے والے ہفت روزہ مجلہ الدعوۃ میں اس موضوع پر اگست ۱۹۹۷ء کے شماروں میں کئی مضامین شائع ہو چکے ہیں اور اسی طرح دیگر عرب ممالک سے بھی آج کل اس طرح کے مضامین اخبارات وجرائد میں پڑھنے کو ملتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ عالمی سطح پر علماء دین کے خلاف پروپیگنڈہ اور زہر اس طرح سے پھیلایا جارہا ہے کہ مسلمانوں کی نئی نسل علماء سے دور ہوکر جہالت کی وادیوں میں بھٹکنے اور بے راہ روی کا شکار ہونے پر مجبور ہو جائے۔ اس کے لئے الیکٹرانک میڈیا کو بطور خاص استعمال کیا جارہا ہے۔

دوسری طرف کمپیوٹر پر اس قسم کے پروگرام پیش کئے جارہے ہیں جو بظاہر مذہبی اور دین فہمی میں بڑے معاون محسوس ہوں گے مگر دراصل یہ بھی عوام کو بالخصوص نوجوانوں کو علماء سے دور کرنے کی سازش ہی کا ایک حصہ ہے۔ دعویٰ کیا جارہا ہے کہ آئندہ صدی میں لوگ مکمل طور پر اپنے فتاویٰ ومسائل کمپیوٹر سے پوچھ سکیں گے اور انہیں علماء کے پاس جانے کی ضرورت نہ رہے گی۔

ان حالات میں علماء کرام کا فرض بنتا ہے کہ وہ نوجوانوں کو اپنے قریب کرنے کی تدبیر کریں تاکہ ان کی اخلاقیات اور دینی معلومات کا معیار بلند ہو سکے۔ کمپیوٹر یا میڈیا معلومات رساں آلہ کا کردار تو ادا کرسکتا ہے اور اسے فروغ اسلام میں جدید وسیلہ کے طور پر استعمال کیا جانا چاہئے مگر وہ اخلاقیات وکردار سازی کا کام انجام نہیں دے سکتا اور سامراج تو چاہتا ہی یہ ہے کہ لوگ معلومات کے اعتبار سے مسلمان ہوں مگر عمل اور اخلاق وکردار کے لحاظ سے یورپی ہوں۔

دینی مدارس (جہاں علماء تیار ہوتے ہیں):

پاکستان ایک ایسا خوش قسمت اسلامی ملک ہے جہاں دینی مدارس اور پرائیویٹ اسکولوں کے قیام پر کوئی پابندی نہیں۔ پرائیویٹ اسکول تو دنیا کے اکثر و بیشتر ممالک میں پائے جاتے ہیں مگر اسلامی ممالک میں دینی مدارس کے پرائیویٹ اداروں کے طور پر قیام کے سلسلہ میں بعض پابندیاں پائی جاتی ہیں۔ بعض اسلامی ممالک ایسے بھی ہیں جہاں مسجد و مدرسہ میں کہیں بھی دینی تعلیم نہیں دی جاسکتی۔ اس اعتبار سے ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمارے ہاں دینی مدارس کے قیام پر کوئی پابندی نہیں۔ مگر اس کا ایک نقصان یہ ہے کہ دینی مدارس کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے جبکہ ان مدارس میں طلبہ کی تعداد میں کمی آرہی ہے اور اس کی بنیادی وجہ ان مدارس کے انتظامات میں پایا جانے والا نقص اور وسائل ہیں۔ اگر دینی مدارس کی درجہ بندی کر دی جائے اور یہ طے کر دیا جائے کہ درجہ اول کے مدارس کی رجسٹریشن صرف ایسے مدارس کو دی جائے گی جہاں طلبہ کی زیادہ سے زیادہ تعداد اتنی اور کم از کم اتنی ہو گی، کمروں کی تعداد اتنی اور ہوسٹل کے کمروں کی اتنی ہو گی۔ اساتذہ اتنے ہوں گے اور اسٹاف اتنا ہو گا۔ وسائل کے اعتبار سے ریزرو (Reserve) فنڈ اتنا ہو گا اور اخراجات کی کم از کم اور زیادہ سے زیادہ حد اتنی ہو گی، قیام و طعام کا انتظام اس معیار کا ہو گا اور دیگر سہولیات کی فلاں مقدار لازمی ہو گی، تو مدارس کی حالت بہتر ہو گی اور ان میں تعلیم پانے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو گا۔ اسی طرح درجہ دوم اور درجہ سوم کے مدارس کے معیارات قائم کر کے اور اسی حساب سے ان کے نصاب کی تقسیم کر کے رجسٹریشن کا حق دیا جاتا تو یقیناً صورتحال بہتر ہوتی۔ راقم الحروف نے ۱۹۷۹ء میں انجمن طلبہ مدارس عربیہ پاکستان کے جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے ملک بھر کے سنی مدارس کا ایک دورہ کیا اور اس وقت مدارس کے طلبہ کی زبوں حالی پر ایک مضمون لکھا تھا جو اس وقت ہفت روزہ تعبیر کے شمارہ ۶ جلد ۱ میں شائع ہوا تھا۔ اس کا ایک اقتباس یہاں نقل کرنا فائدہ سے خالی نہ ہو گا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ ادارے جہاں علماء تیار ہوتے ہیں ان کی مشکلات کیا ہیں اور ان کے طلباء کی کیا؟

دینی مدارس اور طلبائے مدارس اسلامیہ کی مشکلات:

اس وقت دینی مدارس کے طلبہ جن مشکلات سے دوچار ہیں اور دینی مدارس کو جو مسائل درپیش ہیں ان میں سے چند بڑے بڑے حسب ذیل ہیں۔

سب سے بڑا مسئلہ دینی مدارس کیلئے مالی وسائل کی کمی ہے اور یہی بنیادی مسئلہ ہے جس پر باقی تمام تر مسائل کی عمارت کھڑی ہے۔ اس پرابلم کی بناء پر ہمارے دینی مدارس روز بروز ترقی کرنے کے بجائے تنزل کی طرف جارہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں صحیح علماء خال خال نظر آتے ہیں ویسے چٹ پٹی تقریریں کرنے والوں کی کوئی کمی نہیں لیکن جہاں تک معقولات ومنقولات کی درس وتدریس اور مسائل فقہ، قرآن وحدیث پر عبور ہونے کا تعلق ہے اس سلسلہ میں کوئی سو میں سے ایک ہی ملتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دینی مدارس غربت وافلاس کا شکار ہیں۔ دینی مدارس کے طلبہ کو وہ سہولیات حاصل نہیں ہیں جو ایک کالج یا اسکول کے طالب علم کو حاصل ہوتی ہیں چنانچہ نوجوان نسل دینی مدارس کا رخ کم ہی کرتی ہے اور چند علوم دینیہ کے پروانے مدارس میں پہنچ جاتے ہیں ان میں سے بیشتر تعلیم مکمل کرنے سے قبل ہی تقاریر وامامت کا سلسلہ شروع کردیتے ہیں اور اس طرح علماء کم اور نیم علماء زیادہ پیدا ہورہے ہیں۔

دینی مدارس کے مالی وسائل کا انحصار زیادہ تر زکوۃ وصدقات پر ہے اس کے علاوہ عطیات، چرمہائے قربانی وغیرہ ذرائع آمدن ہیں بہت کم مدارس (آٹے میں نمک کے برابر) ایسے ہیں کہ جن کی آمدن ان ذرائع کے علاوہ ان مدارس کی جائیداد سے ہو۔ اسی لئے کسی بھی مدرسے کی انتظامیہ قبل از وقت یہ نہیں کہہ سکتی کہ آئندہ سال مدرسے کی کیا پوزیشن ہوگی۔ اب جب کہ حکومت نے خود زکوۃ وصدقات وصول کرنے کا پروگرام بنایا ہے تو اس سے مدرسے مزید مالی بحران کا شکار ہوسکتے ہیں۔ ہاں اگر حکومت نے مدارس کو معقول امداد مہیا کی تو پھر توازن برقرار رہ سکنے کی امید کی جاسکتی ہے۔

دینی مدارس کے مالی وسائل کی کمی کی وجہ سے ہی مدارس کے انتظامات درست نہیں ہو پاتے مثلاً ہوسٹل، خوراک لباس، کتب جو ایک مدرسے کی بنیادی ضروریات ہیں ان میں سے ایک ایک کو لیجئے۔ میں صوبہ سرحد کے علاوہ دیگر تمام صوبوں کے بڑے بڑے شہروں میں

بلکہ بڑے بڑے گاؤں میں موجود مدارس میں گیا ہوں اور میں نے دیکھا کہ بعض مدارس میں رہائش کے لئے ہوسٹل نہیں ہیں اور طلبہ مساجد کے حجروں میں یا درس گاہ ہی میں رہتے ہیں اور تدریسی کمرے کو بطور رہائش گاہ بھی استعمال کرتے ہیں جن مدارس میں ہوسٹل کے لئے بلڈنگ موجود ہے تو وہاں فرنیچر نہیں۔ فرنیچر سے میری مراد کوئی صوفہ سیٹ، بیڈ وغیرہ نہیں بلکہ یہی سیدھی سادھی چارپائیاں تک بھی نظر نہیں آتیں۔ اگر کسی مدرسے میں یہ انتظام بھی ہے تو پھر وہاں خوراک کا مسئلہ تشویش ناک ہے صبح شام دال پکتی ہے اور جب دال طلباء کے سامنے آتی ہے تو وہ بے حال ہو کر یہ مقولہ پڑھتے ہیں:

اَلدَّالُ یَدُلُّ عَلیٰ قِلَّۃِ الْمَالِ وَ کَثْرَۃِ الْعِیَالِ

اس میں مدارس کی انتظامیہ کا کوئی قصور نہیں بلکہ ان کے پاس اتنے وسائل ہی نہیں ہوتے کہ وہ طلبہ کو بہترین طعام مہیا کر سکیں۔ بلکہ جو دال بھی ملتی ہے تو وہ بھی ان کی رات دن کی بھاگ دوڑ کر کے حاصل کی ہوئی قلیل پونجی کے توسط سے میسر آتی ہے۔ ہاں البتہ چند مدارس ایسے بھی ہیں جہاں کھانے کا معقول انتظام ہے اور بکرے بیچ کر جہاں دال نہیں خریدی جاتی۔ میں نے بلوچستان اور اندرون سندھ کے ایسے مدارس بھی دیکھے ہیں جہاں مدرسے کے پڑوسی، طلبہ کو کھانا مہیا کرتے ہیں ایک گھر پر ایک طالب علم کا کھانا مقرر ہوتا ہے اور طلبہ گھروں سے کھانا مانگ کر لاتے اور نہایت تشکر سے کھاتے ہیں یہ ان کی کمال استقامت ہے۔ خوراک کے بعد مدرسے کے لئے بڑا مسئلہ کتب کی فراہمی کا ہے کیونکہ مدارس کے نصاب میں جو کتب پڑھنا پڑھانا اشد ضروری ہیں ان کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرتی ہیں قدوری مدرسہ کے دوسرے تیسرے درجہ کی کتاب ہے جس کی قیمت تقریباً سو روپے ہے، طالب علم اس قابل نہیں ہوتے کہ وہ اپنی کتابیں خود خرید سکیں۔ لہٰذا ہر مدرسے کو ایک اچھے خاصے کتب خانہ کی ضرورت ہوتی ہے اگر صرف درسی کتابیں ہی خریدی جائیں تو ہر مدرسہ کے پاس کئی لاکھ روپے کی کتابیں ہونا ضروری ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دینی مدارس کے طلبہ اپنا پیٹ کاٹ کر مدرسے میں کتابیں مہیا کرنے میں لگے رہتے ہیں مدارس کی آمدن کا ایک بڑا حصہ خوراک کے بعد کتابوں پر خرچ کرنا پڑتا ہے۔

اسی طرح طلبہ کے لباس کا مسئلہ ہے بعض طلبہ اتنے غریب ہوتے ہیں کہ گھر سے کپڑے بھی حاصل نہیں کر سکتے مجھے گزشتہ ماہ سندھ اور حال ہی میں بلوچستان کے مدارس کا تنظیمی دورہ کرنے کا موقع ملا، میں نے بلوچستان کے ایک مدرسے میں ایک طالب علم کو دیکھا جو کسی ساتھی سے دھوتی مانگ کر پہنے ہوئے اپنے کپڑے دھو رہا تھا اور دوسرا ساتھی اس سے اپنی دھوتی واپس مانگ رہا تھا۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ اس کے پاس ایک ہی کپڑوں کا جوڑا ہے جسے وہ دھو کر پہنے گا اور میلا ہونے پر پھر اسی کو دھو کر پہننا ہوگا، مالی اعتبار سے اندرون سندھ، بلوچستان اور سرحد کے مدارس زیادہ زبوں حالی کا شکار ہیں۔ (ہفت روزہ تعبیر کراچی، شمارہ ۶، ستمبر ۱۹۷۹ء، بتصرف قلیل)

دینی مدارس کی ذمہ داری:

درسگاہوں کی بھی عجب شان ہے۔ ہر سال متعدد طلبہ کسی درسگاہ سے فراغت پاتے ہیں اور نئے طلبہ کو مادر علمی کی آغوش میں جگہ ملتی ہے جہاں وہ تعلیم و تربیت کا دور شروع کرتے ہیں اور یوں یہ سلسلہ سال ہا سال جاری و ساری رہتا ہے۔ نتیجتاً قوم و ملک کو مختلف شعبوں میں افرادِ کار ملتے رہتے ہیں۔ گویا درسگاہوں کی مثال فیکٹریوں کی سی ہے جہاں خام مال پر مختلف عمل (Process) کر کے اسے اس قابل بنایا جاتا ہے کہ وہ ایک خاص سانچے میں ڈھل کر ایک خوب صورت و مفید پروڈکٹ کی صورت میں مارکیٹ میں پہنچے اور اسے ضرورت مند ہاتھوں ہاتھ لیں، جو مال زیادہ عمدہ ہوتا ہے اس کی بکنگ فیکٹری ہی میں ہو جاتی۔ جو اچھا ہوتا اسے مارکیٹ میں زیادہ دیر اپنے خریداروں کا انتظار نہیں کرنا پڑتا اور جو دوسرے درجہ کا مال ہوتا ہے وہ جلد یا بدیر کوئی نہ کوئی گاہک پالیتا ہے۔ البتہ تیسرے درجہ کا مال چل تو جاتا ہے مگر یا تو بہت دیر سے یا سستے داموں۔ اور ایسے مال کی کھپت کی جگہ عموماً ایسی منڈیاں یا بازار ہوتے ہیں جن کے آس پاس نسبتاً غریب، ان پڑھ یا تیسرے درجہ کے لوگ آباد ہوں۔ فیکٹریاں اور ان کے مالک سارا سال زیادہ سے زیادہ ''مال بنانے'' کے چکر میں رہتے ہیں اور خریدار اپنے مال کے عوض حاصل کردہ مصنوعات سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے کے پھیر میں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ خام مال جتنا عمدہ ہوگا اس سے بننے والی اشیاء بھی اتنی ہی نفیس اور قابل بھروسہ ہوں گی اور جس قدر محنت اور تکنیک سے خام مال کو مصنوعات میں تبدیل کیا جائے گا اسی قدر ان میں نکھار بھی پیدا ہوگا۔ فیکٹری ملازمین اور کارخانہ دار کے تعلقات مصنوعات پر اثر انداز ہوتے ہیں اور موسمی و سیاسی حالات بھی۔

اچھی اور معیاری فیکٹریاں کوالٹی کنٹرول کا ایک مستقل شعبہ رکھتی ہیں جس پر کارخانہ دار لاکھوں روپے خرچ کرتا ہے تاکہ اس کی مصنوعات مارکیٹ میں اپنی شناخت و معیار قائم رکھ سکیں یا کارخانہ کی شہرت و نیک نامی میں روز بروز اضافہ تو ہو مگر کمی نہ آئے۔ بعض مصنوعات ایسی شہرت پاتی ہیں کہ برسوں اور نسلوں ان کے نام لوگوں کی نوک زباں پر رہتے ہیں۔ عمدہ کوالٹی کی بدولت ایسی مصنوعات تیار کرنے والی کمپنیاں یا ادارے بھی لوگوں میں مقبول اور پاپولر ہوتے ہیں اور ایسے ممالک بھی بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں جہاں کی مصنوعات قابلِ اعتماد ہوں۔

عام درسگاہیں ملک کے لئے Skilled مین پاور تیار کرنے والی فیکٹریاں ہیں جبکہ دینی درسگاہوں کا کام ملک وقوم کو ایسے تعلیم و تربیت یافتہ رجال کار فراہم کرنا ہے جو عوام کو دینی معاملات میں مکمل رہنمائی فراہم کرسکیں۔ قوم کو غیر اسلامی اور خلاف مذہب نظریات کا شکار ہونے سے بچائیں اور مختلف عوامل کی بناء پر عوام کے دلوں اور دماغوں پر چڑھ جانے والے لادینیت کے رنگ و زنگ کو دھوسکیں۔ ان میں اتنی ایمانی قوت ہو کہ وہ اپنے فرض کی ادائیگی میں کسی لَوْمَۃَ لائم کی پرواہ نہ کریں اور وقت کے فرعونوں سے ٹکرا جانے کا جذبہ و صلاحیت رکھتے ہوں۔

مدارس کا نیا بحران:

دینی مدارس صدیوں سے اپنا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ ان مدارس نے ایسی ایسی عظیم شخصیات پیدا کی ہیں جن سے کفر لرزہ براندام ہے۔ اسلام جن پر رشک کرتا ہے اور زمانہ کو جن پہ ناز ہے، ہر دور کے فرعونوں سے ٹکرانے کا کام انہی دینی مدارس کے تربیت

یافتگان نے انجام دیا ہے اور بدطینت و بدمست اقبالِ اقتدار کو ہمیشہ انہی نے نکیل دی ہے۔ گزشتہ صدیاں ان کے ان گنت کارناموں سے بھری پڑی ہیں۔ مگر بدقسمتی سے گزشتہ چند برسوں سے یہ درسگاہیں کچھ انحطاط پذیر اور روبزوال ہیں۔ جس کی کئی وجوہات ہیں، منجملہ ان کے، مناسب خام مال کی عدم دستیابی، خام مال پر مطلوبہ محنت کا فقدان، مارکیٹ میں تیار مال کی بے وقعتی، سرکاری سطح پر علم و دانش کی عدم سرپرستی بلکہ حوصلہ شکنی، ملکی و بین الاقوامی اقتصادی صورتحال، مولوی نما مسٹروں کی مدارس پر اجارہ داری، مدارس کے نصاب میں نت نئی پیوندکاری اور دینی مدارس کو نفع بخش کاروبار کے طور پر اپنانے کی دھن ہے۔ ایسے حالات میں ان مدارس سے کچے پکے افراد نہیں نکلیں گے تو کیا علامۃ الدھر پیدا ہوں گے؟

قحط الرجال کا عالم یہ ہے کہ لاہور میں ملک کی سب سے بڑی دینی درسگاہ قائم کرنے کا دعویدار مہتمم کراچی جیسے بنجر شہر میں مدرسین تلاش کرتا پھر رہا ہے اور کراچی کے مدارس اساتذہ کی انتظار میں لاہور، فیصل آباد، سرگودھا اور راولپنڈی کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ وہ مراکز جہاں مدرسین تیار ہوتے تھے مادیت پرستی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ جن باغوں سے علم کی مہک آیا کرتی تھی وہ آہستہ آہستہ شیشے کے گھروں اور کارپارکوں میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ لیکن کیا یہ سب کچھ ایک دم اور اچانک ہو گیا نہیں! ہرگز نہیں! بلکہ یہ سب ہنود و یہود کی طویل منصوبہ بندی کے نتیجہ میں بتدریج ہوا ہے۔ مغلیہ دور کے بعد انگریزوں نے پہلا کام یہ کیا کہ دینی مدارس کے اوقاف ختم کر دیئے اور وہ جاگیریں جو مدارس کی آمدن کے لئے سرکار سے ملتی تھیں اور جن سے مدارس کے اخراجات چلتے تھے وہ واپس لے لی گئیں، مراعات ختم کی گئیں اور مدارس کو محلّہ و اہل محلّہ کی زکوٰۃ و صدقات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔ ہمارے اکابر دشمنان اسلام کی ریشہ دوانیوں سے بخوبی آگاہ اور واقف تھے مگر اس کے سدباب کے لئے انہیں مل بیٹھ کر سوچنے اور مستقل منصوبہ بندی کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی سامراج نے ان کے سامنے نت نئے مسائل کے پہاڑ کھڑے کر کے ان کے ذہنوں کو ایسا مصروف کیا کہ وہ انہی میں الجھ کر رہ گئے اور مستقبل کی منصوبہ بندی کا انہیں موقع ہی نہ ملا۔ لیکن کیا وقت ہاتھ سے نکل چکا ہے؟ یقیناً جواب نفی میں ہو گا۔ تو پھر ضرورت اس امر کی ہے

کہ اس وقت فوری طور پر بقیہ السلف علماء کرام مل بیٹھ کر مستقبل کی منصوبہ بندی کریں۔ مدارس کے وقار کو مجروح ہونے سے بچائیں اور ہر سال چند باریش نوجوانوں کو جبہ و دستار سے مزین کر کے دارالعلوم سے فارغ کرنے کی رسمی کارروائی کی حوصلہ شکنی کریں اور طلباء کو لباس تقویٰ سے آراستہ اور زیور علم سے مالا مال کر کے میدان عمل میں اتار کر معاشرہ و فرد کی اصلاح کا مذہبی فریضہ انجام دینے کی بنا تازہ کریں۔

اس حقیقت سے انکار شاید دشواری ہی نہیں ناممکن بھی ہو کہ فی زمانہ فارغ التحصیل ہونے والے طلبہ کو سند عطا کرنے والا مدرسہ خود بھی انہیں اپنے ہاں بحیثیت عالم و مدرس جگہ دینے کو تیار نہیں (الا ماشاء اللہ) اور ان سند یافتہ و دستار بند طلبہ کو محفل یاراں میں اصحاب مدارس کا جاہل گردانا اور گزارہ لائق ٹھہرانا اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ ماسوا گنتی کے چند مدارس و افاضل کے کہ جنہیں کامل اعتماد ہے کہ انہوں نے طلباء کی زندگیوں سے نہیں کھیلا بلکہ ان کی زندگی واقعتاً سنواری اور بنائی ہے اور جنہیں یہ یقین ہے کہ انہوں نے سستی شہرت و نیک نامی کی خاطر اپنی اسنادیوں ہی تقسیم نہیں کیں نہ رسمی کارروائی نبھانے کی خاطر دستاروں کے تھان ضائع کئے ہیں۔ ایسے مدارس اگرچہ ان گنت نہیں گنتی ہی کے ہیں تاہم کرہ ارض پر پائے جاتے ہیں۔ جہاں طلبہ کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے اور جہاں کے فارغ التحصیل طلباء ملک و بیرونی ملک تبلیغ دین کے سلسلہ میں اپنی قابل قدر مساعی کی بدولت عزت و شہرت رکھتے ہیں دین کا جو تھوڑا بہت بھرم قائم ہے انہی کا مرہون منت ہے۔

علماء کی تیاری میں دینی مدارس کا کردار:

فی زمانہ علماء و آئمہ مساجد کی کردار سازی میں دینی مدارس کی ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ مدارس کے ارباب حل و عقد کو چاہئے کہ وہ مدارس میں زیر تربیت بچوں کی اخلاقی تربیت بہتر بنانے اور انہیں مستقبل میں پیش آمدہ خطرات سے مقابلہ کے لئے پوری طرح تیار کریں۔ نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ دینی مدارس کے بعض فضلاء خصوصاً جو صرف حفظ و قرأت کا کورس کر کے امام بن جاتے ہیں، اخلاقی اعتبار سے نہایت کمزور اور اپنے

منصب کے تقاضوں سے یکسر ناواقف ہوتے ہیں۔ اس پر بھرپور توجہ کی ضرورت ہے۔

الغرض آئمہ حضرات کو اپنے فرائض منصبی نہایت دیانتداری اور خلوص سے ادا کرنے چاہئیں اور اللہ تعالیٰ سے اس پر اجر کی امید رکھنی چاہئے نہ کہ مقتدیوں اور مسجد انتظامیہ سے کسی تعریف وتوصیف اور جزائے خیر کی توقع۔

اسی طرح کمیٹیوں کے اراکین اور نمازیوں کو اپنی اصلاح پر توجہ دینی چاہئے نہ کہ امام میں کیڑے نکالنے اور اس کی غیبت کے مواقع تلاش کرنے پر۔

اللہ رب العزت افراط وتفریط کے شکار مسلمانوں کو ہدایت نصیب فرمائے۔ (آمین)

حواشی

۱۔ مراقی الفلاح، شرح نور الایضاح، ص ۶۷ مکتبہ امدادیہ، ملتان۔

۲۔ الفقہ علی مذاہب الاربعہ، جلد اول، ص ۶۵۱، علماء اکیڈمی، لاہور۔

۳۔ غنیۃ الطالبین، ص ۵۲۲، مدینہ پبلشنگ کراچی، ۱۹۷۸ء۔

۴۔ فتاویٰ عالمگیری، جلد اول، ص ۱۲۸، حامد اینڈ کمپنی، لاہور۔

۵۔ ہدایہ اولین، باب الامامہ، جلد ۱، ص ۱۲۱، مکتبہ شرکت علمیہ، لاہور۔

۶۔ عین الہدایہ، جلد اول، ص ۴۴۴، امجد اکیڈمی، لاہور۔

۷۔ کنز العمال، ج ۷، حدیث ۲۰۴۳۴۔

۸۔ بدائع الصنائع، ج ۱، ص ۲۱۹، ایچ ایم سعید اینڈ کو، کراچی

۹۔ السنن الکبریٰ، للبیہقی، ج ۲، ص ۲۳۶، ملتان۔

۱۰۔ صحیح بخاری، ج ۱، ص ۵۶، نور محمد اصح المطابع، کراچی

۱۱۔ مجمع الزوائد، ج ۲، ص ۵۱، دار الکتاب العربی۔

۱۲۔ بخاری، ج ۱، ص ۱۵۹، نور محمد اصح المطابع، کراچی۔

۱۳۔ شرح صحیح مسلم از علامہ غلام رسول سعیدی، ج ۶، ص ۵۷۷، فرید بک اسٹال، لاہور

۱۴۔ ایضاً، ص ۵۷۸۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۵۷۸۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۵۷۶۔

۱۷۔ یعنی اگر چہ چھوٹی سورہ پڑھے تو اس سے بھی سنت ادا ہو جائے گی۔

۱۸۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ: یعنی مقتدین رغبت والوں کے ساتھ سو آیت تک پڑھے اور کسل والوں کے ساتھ چالیس پڑھے اور اوسط درجہ والوں کیساتھ پچاس سے ساٹھ تک پڑھے اور راتوں کی درازی و کمی کو دیکھے اور امام اپنے مقتدیوں کے اشغال کی زیادتی و کمی کا لحاظ رکھے۔

۱۹۔ بنظر اس فائدہ کے کہ لوگ اول رکعت سمیت پوری جماعت کو پائیں یہ بات حدیث مرفوع ابو قتادۃ رضی اللہ عنہ میں جو ابو داؤد میں ہے مصرح ہے۔

۲۰۔ جمعہ اور عیدین میں بالاتفاق دونوں رکعتیں برابر پڑھنی چاہئیں اور حلیہ میں امام محمد اور شیخین کی دلیلیں نقل کر کے کہا کہ فتویٰ شیخین کے قول پر ہونا چاہئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابو موسیٰ اشعری کو نامہ لکھا کہ فجر اور ظہر میں طوال مفصل پڑھا کر اور عصر اور عشاء میں اوساط مفصل اور مغرب میں قصار مفصل۔

۲۱۔ نوادر معلے میں ابو یوسف سے روایت ہے کہ ایک شخص فقط اس قدر کہ الحمد للہ رب العالمین پڑھ سکتا ہے تو وہ اسی کو ہر رکعت میں ایک بار پڑھے اور مکرر نہ کرے اور اس کی نماز جائز ہے اور یہی امام ابو حنیفہ کا قول ہے اور مبسوط میں ہے کہ سنت ادا ہونے میں ایک بڑی آیت بمنزلہ تین آیات کے ہے۔

۲۲۔ مثلاً ح نہیں ادا ہوتی تو مثلاً الھمد بجائے الحمد کے نکلے یا اعوذ کا عین نہ نکلا اور الف نکلا یا الصمد کی جگہ سین نکلا پس وہ رات و دن اس کے صحیح نکالنے میں کوشش کرتا ہے اور نہیں قادر ہوتا ہے نماز جائز ہے اور اگر کوشش چھوڑ دی تو فاسد ہے اور یہ گنجائش نہیں کہ باقی عمر میں کوشش چھوڑ دے۔

۲۳۔ اگر قولہ الست بربکم قالوا بلٰے' میں قالوا نعم پڑھا تو فاسد ہے، انت العزیز

الکریم میں الحکیم پڑھا تو مختار یہ کہ فاسد ہے قبل طلوع الشمس و قبل الغروب میں عند طلوع الشمس و عند الغروب پڑھنا مفسد ہے والنازعات نزاعا مفسد نہیں یہ عمدہ توضیح عین الہدایہ اردو شرح ہدایا میں ہے۔

۲۴۔ مقتضائے ادب یہی ہے جیسے تلاوت قرآن میں ۲۵ پارہ پر الیہ یرد علم الساعہ الخ میں کہا گیا کہ اعوذ باللہ کے بعد الشیطان الرجیم نہ ملاوے کہ الیہ کی ضمیر میں وہم ہوتا ہے کہ شیطان کی طرف ہے۔

۲۵۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کے اجماع سے یہ مصحف جو متواتر ہے مع متوارث قرأت کے جمع ہوا ہے پس جو قرآن کی قرأت میں سے نہ ہو وہ قرآن نہیں یعنی قرآن تو متواتر قطعی متوارث کا نام ہے اور وہ شاذ قرأت نہیں ہے تو اس میں قرآن کی صفت نہ ہوئی۔

۲۶۔ فتاویٰ عالمگیری، جلد اول، ابواب قرأت مختلف صفحات، حامد اینڈ کو، لاہور۔

۲۷۔ صحیح مسلم بشرح النووی، ج ۵، ص ۱۰۲، مکتبہ المثنیٰ، بیروت۔

۲۸۔ ایضاً۔

۲۹۔ کنز العمال، ج ۸، حدیث ۲۳۲۸۰۔

۳۰۔ فتاویٰ عالمگیری، ج ۱۔

۳۱۔ سنن ابوداؤد، ج ۱، ص ۲۰۴، مطبع مجتبائی، لاہور۔

۳۲۔ مفتی محمد شفیع صاحب، البلاغ، کراچی۔

۳۳۔ فتاویٰ عالمگیری، ج ۱۔

۳۴۔ بائبل، کتاب پیدائش، باب ۳۵۔

۳۵۔ بائبل، کتاب پیدائش۔

۳۶۔ بائبل، کتاب پیدائش، باب ۳۵۔

۳۷۔ بائبل، سفر سموئیل ثانی، بات ۱۱۔

۳۸۔ ملفوظات خواجہ نظام الدین اولیاء۔

۳۹۔ مہر منیر، ص ۵۴۔

پروفیسر ڈاکٹر نور احمد شاہتاز صاحب کی درج ذیل کتب و رسائل

ہمارے ہاں دستیاب ہیں.

۱. تاریخ نفاذ حدود

۲. کاغذی کرنسی کی شرعی حیثیت

۳. کریڈٹ کارڈ (تاریخ، تعارف، شرعی حیثیت)

۴. کلوننگ (خدشات، شرعی نقطہ نظر)

۵. امام و خطیب کی شرعی و معاشرتی حیثیت

۶. مختصر نصاب سیرت
۷. مختصر نصاب فقہ

۸ مختصر نصاب قرآن
۹۔ مختصر نصاب حدیث

۱۰. انڈیکس شرح صحیح مسلم
۱۱. روزہ رکھیے مگر !

۱۲۔ قربانی کیسے کریں
۱۳۔ آسان و مختصر دعائیں

۱۴۔ لوگ کیا کہیں گے؟
۱۵۔ کڑوی روٹی

۱۶۔ منتخب مباحث علوم القرآن

۱۷ پندرھویں صدی کا مجدد کون؟

۱۸۔ شیئرز کے کاروبار کی شرعی حیثیت

۱۹۔ رطب و یابس (مجموعہ مضامین)

۲۰۔ بینکوں کے ذریعہ زکوۃ کی کٹوتی کی شرعی حیثیت

۲۱ مفتی کون؟ فتوی کس سے لیں؟

مفتی اور منصب مفتی

منصب افتاء جس قدر پروقار ہے اتنی ہی یہ ذمہ داری نازک بھی ہے۔ اس منصب کے کچھ اپنے تقاضے ہیں۔ ثقاہت علمی اور عدالت و دیانتداری کے ساتھ ساتھ ایک مفتی کا دور اندیش اور زیرک ہونا بھی انتہائی ضروری ہے۔ پاکستان کے تقریباً تمام شہروں اور دیہاتوں میں نامور مفتیان کرام کی ایک بڑی تعداد بحمد للہ فریضہ افتاء کی ادائیگی میں مصروف ہے اور عوام پاکستان دینی معاملات میں مفتی کی رائے (فتویٰ) کو ہی حتمی سمجھتے ہیں۔ اصحاب علم و فضل اور نامی گرامی مفتی صاحبان کے علاوہ ایسے افراد کی بھی ہمارے ہاں کمی نہیں جو محض نام و نمود کی غرض سے اپنے نام کے ساتھ مفتی کا سابقہ لاحقہ بڑے طمطراق سے استعمال کرتے ہیں اگرچہ وہ اس علمی وفقہی معیار پر کسی طور پر پورے نہ اترتے ہوں جو مفتی کے لئے درکار ہے۔ چنانچہ گلی محلوں میں اس طرح کے مفتیوں کی کمی نہیں جو محض اپنے قد کاٹھ، ڈیل ڈول، وضع قطع اور جبہ و دستار کے بل بوتے پر مفتی کے درجہ پر فائز ہیں۔ اس طرح کے مفتی حضرات عموماً بڑے سوشل (Social) اور جذبہ افہام و تفہیم (Compromising Mind) کے حامل ہوتے ہیں اور علاقہ میں ان کا اثر و رسوخ بھی ان کی انہی خوبیوں کی بناء پر ہوتا ہے۔ دینی مسائل میں ان کے ہاں خاصی لچک پائی جاتی ہے اور اختلافی مسائل میں ان کی رائے کا ایک اہم اصول ''ایک روایت میں یوں بھی آتا ہے'' مقرر ہے۔

چونکہ بدقسمتی سے ہمارے ہاں لوگ دیگر شرعی مسائل کی طرح ''منصب مفتی'' کے لئے بھی بنیادی شرائط اہلیت تک سے واقف و آگاہ نہیں۔ اس لئے وہ ہر ''دعویدار مفتی'' اور ہر ''امیدوار منصب افتاء'' کو محض اس کے دعویٰ کی بنیاد پر مفتی تسلیم کرتے ہوئے اس سے شرعی مسائل میں رجوع کرنے لگتے ہیں اور پھر جب اس کی دی ہوئی رائے (فتویٰ) کو مطابق شریعت نہیں پاتے تو وہ دین اور علماء دین کے خلاف یکساں منفی رجحانات کا شکار ہو کر اصل مفتیوں اور شرع اسلام تک کو نظروں سے گرا دیتے ہیں۔

پاکستان میں کچھ لوگ حادثاتی طور پر بھی مفتی بن گئے ہیں۔ مثلاً کسی دینی ادارہ کے سربراہ کا انتقال ہوا جو واقعی مفتی تھے تو اب ان کا انتظامی جانشین بھی منصب افتاء پر براجمان ہو گیا جبکہ کچھ لوگوں کو وفاقی شرعی عدالت اور اسلامی نظریاتی کونسل کی ممبری کی ہوس نے مفتی بنا دیا۔ وفاقی شرعی عدالت کے قیام کے وقت یہ طے پایا تھا کہ اس میں ایسے اسکالرز کو شامل کیا جائے گا جو کم از کم پندرہ سال سے تدریسی تحقیقی یا افتاء کی ذمہ داری ادا کر رہے ہوں۔ شروع شروع میں واقعتاً حقیقی علماء و اسکالرز ہی کو اس میں شامل کیا گیا۔ لیکن محمد ضیاء الحق مرحوم (سابق صدر) کے انتقال کے بعد جیسے ہی ''عوامی دور'' آیا اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت میں بھی عوامی قسم کے مفتیوں کے تقرر کا سلسلہ شروع ہوا۔ چنانچہ بہت سے عوامی مفتیوں نے شیروانیوں سمیت اسلام آباد یاترا شروع کر دی۔ مذکورہ اداروں میں گنجائش کم تھی کچھ کی قسمت نے یاوری نہ کی اور پھر اقتدار کے ردو بدل میں بہت سے امیدواروں کی شیروانیاں بغیر حلف لئے پرانی ہو گئیں۔ کئی خود ساختہ مفتی ان اداروں میں جانے سے محروم رہے تاہم انہیں یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اس طرح انہیں اپنے نام کے ساتھ مفتی کا بھاری بھرکم لفظ استعمال کرنے کا بہانہ ہاتھ آ گیا۔ اللہ ان کے حال پر رحم فرمائے۔

ذیل میں منصبِ افتاء کے لئے درکار اہلیت اور مفتی کا ٹائٹل (لقب) استعمال کرنے کی اجازت سے متعلق فقہاء و آئمہ اسلام کی تصریحات و آراء پر مبنی ایک فکر انگیز تحریر کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے، جو محمد المکی ناصری کی ہے اور الشریعہ والفقہ والقانون نامی رسالہ سے ماخوذ ہے جو مراکش سے شائع ہوا ہے۔

ظہور اسلام سے اہل اسلام اپنے مذہب کی تعلیمات نسل در نسل حاصل کرتے رہے ہیں۔ سابقون الاولون نے تعلیم دین براہ راست جناب سرور کائنات خاتم الانبیاء والمرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام سے حاصل کی اور نبی اکرمؐ نے امت کو تعلیم دین اس فریضہ کی ادائیگی کے طور پر فرمائی جس کے لئے آپ مبعوث کیے گئے تھے اور اس حکم کی تعمیل فرمائی جو آپ کو آپ کے رب نے ان الفاظ میں دیا تھا:

یٰاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَه‘۔ (المائدہ، آیت ٦٧)

صحابہ کے بعد کے لوگوں نے تعلیم دین ان لوگوں سے پائی جو ''ورثاءِ علم رسول'' اور حاملین دین متین قرار پائے امت کے اس گروہ نے تبلیغ دین کا فریضہ اس حکم ربانی کے پیش نظر انجام دیا۔

لَتُبَیِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَکْتُمُوْنَهٗ (آل عمران، آیت ۱۸۷)

نیز

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْھُدٰی مِنْ م بَعْدِ مَا بَیَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِی الْکِتٰبِ اُولٰٓئِکَ یَلْعَنُھُمُ اللّٰهُ وَ یَلْعَنُھُمُ اللّٰعِنُوْنَ ٥ (البقرۃ، آیت ۱۵۹)

چونکہ ان اہل علم کے نزدیک (حسب حکم الٰہی) کتمان دین موجب لعنت تھا اس لئے انہوں نے تبلیغ دین میں کوئی کسر نہیں رہنے دی۔

قرآن کریم کا یہ اعجاز ہے کہ اس نے دیگر اوصاف کے علاوہ سابقون الاولون کے ان سوالات کو بھی محفوظ رکھا ہے جو وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلیم دین کے سلسلہ میں کیا کرتے تھے۔ ان سوالات کی حفاظت اس لئے بھی ممکن ہوئی کہ یہ نزول وحی کا زمانہ تھا اور احکام شرعیہ کے بارے میں استفسارات یا بیان شدہ احکامات کی تشریح و توضیح کے سلسلہ میں سوالات کے جوابات بذریعہ وحی دیئے جاتے تھے۔ اکثر و بیشتر اس قسم کے استفسارات کے لئے جو صیغہ قرآن نے استعمال کیا ہے وہ ''سوال'' کا ہے اور بسا اوقات لفظ ''استفسار''

استعمال ہوا ہے جس کے معنی "طلب فتویٰ" ہیں۔ اس قسم کے بعض سوالات سورۃ بقرہ میں ہیں جن کی تعداد سات ہے۔ (۱) ایک سوال سورۃ مائدہ، ایک سورۃ انفال اور دو سورۃ النساء میں ہیں۔ (۴،۳،۲) مثلاً

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى ....الخ

وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَاءِ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ....الخ

یہ تو سوالات و استفسارات کی وہ قسم ہے جو اہل ایمان کی طرف سے کئے گئے یا تعلیم و اخذ دین کی خاطر تھے اور جن کے پیچھے جذبہ مثبتہ (Positive Thinking) کارفرما تھا۔ جبکہ استفسارات کی دوسری قسم وہ ہے جس کا تعلق اعداء اسلام سے ہے، ایسے استفسارات ہمارا موضوع بحث نہیں کیونکہ ان کا مقصد حقائق دین جاننا ہرگز نہ تھا بلکہ غرض دین میں جدال و فساد اور خواہ مخواہ کی بحث و تکرار پیدا کرنا تھا تاکہ لوگوں بالخصوص نومسلموں کے ذہن کو پراگندہ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پریشان کیا جاسکے۔ ایسے استفسارات کی مثال:

وَ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ. قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ (۵) ہے۔

جہاں قرآن کریم نے دینی نوعیت کے ایسے استفسارات جو صیغہ سوال سے شروع ہوتے ہیں انہیں محفوظ کیا وہیں سنت رسول ﷺ نے ایسے متعدد استفسارات کی حفاظت کا بندوبست کر دیا جن میں صیغہ استفتاء یا افتاء کا استعمال زبان رسالت یا کلام صحابہ و تابعین سے ثابت ہے۔ اس قسم کے استفسارات سے کتب صحاح، سنن و مسانید کا ذخیرہ مملو ہے۔ چنانچہ اسی نہج پر چلتے ہوئے سلف صالحین کی اتباع میں مسلمانوں کے ہاں استفتاء و افتاء کی سنت جاری ہوئی اور اس کیلئے لفظ فتویٰ کا استعمال عام ہوا۔ اب ہر دینی معاملہ و شرعی استفسار استفتاء یا فتویٰ کہلاتا ہے۔

لفظ فتویٰ کا اشتقاق اور فقہاء کے ہاں اس کے اصطلاحی معنی:

لغت کی کتابوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ لفظ "الفتویٰ" اشتقاقی لحاظ سے لفظ "الفتاء" سے گہرا تعلق رکھتا ہے اور الفتاء کے معنی نوعمری کے ہوتے ہیں کہا جاتا ہے فَتُـوَ، يَفْتُو ، وفتي، يفتي، فتي، فهو، فتي السن یعنی نوعمر۔

علامہ ابن منظور افریقی نے لسان العرب میں اور ان کی متابعت میں ابو حیان نے اپنی تفسیر میں اس آیت کریمہ (وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَآءِ) کے (۶) ضمن میں لکھا ہے ''الفتیاء، تبیین المشکل من الاحکام'' یعنی فتیا کے معنی ایسا نوجوان جو پروان چڑھ رہا ہو اور توانا ہو، گویا مفتی وہ ہے جو ایسے امور کی وضاحت کر کے انہیں جاندار بنا دے جن کا سمجھنا ویسے دشوار ہو۔

امام رازی نے (افتونی فی امری) کے معنی میں لکھا ہے ای افتونی، اجیبونی فی الامر الفتی۔ یعنی اس مشکل امر میں مجھے مشورہ دو، جواب دو اور فتویٰ کے معنی کسی مسئلہ میں نیا جواب ہیں۔ گویا یہ لفظ ''حدیث السنن'' یا نوعمری کے لئے استعمال ہونے والے صیغہ فتی سے استعارۃ لیا گیا ہے۔ (۷) شافعیہ کا کہنا ہے کہ فتویٰ کے معنی کسی نئے پیش آمدہ مسئلہ کا نیا جواب ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ پیش آمدہ مسئلہ یا تو فی نفسہ بالکل نیا ہوگا یا پھر اس سے ملتے جلتے مخصوص مسائل کے اعتبار سے وہ نیا ہوگا۔ (۸)

اصطلاح فقہاء میں فتویٰ کے معنی کسی شرعی مسئلہ میں مستفتی کو اس پر عمل کا پابند کئے بغیر حکم شرعی کو بیان کر دینا ہے اور استفتاء کا جواب مفتی کی جانب سے زبانی ہوگا الا یہ کہ سائل تحریری سوال کرے اور اس کا تحریری جواب چاہے۔

چونکہ دینی امور میں فتویٰ یا منفی اثرات بھی یقینی ہیں۔ اس لئے مختلف مذاہب فقہ کے علماء نے فتویٰ نویسی یا ''افتاء'' کو خصوصی اہمیت دی ہے اور اس کے لئے باقاعدہ قواعد و ضوابط مقرر کئے ہیں جن کا لحاظ رکھنا اور ان سے غفلت نہ برتنا مفتی کے لئے انتہائی ضروری ہے تاکہ اس شعبہ کو بازیچہ اطفال نہ بنا لیا جائے۔ ایسے لوگ جو اس منصب کے اہل نہ ہوں انہیں اس منصب کے وقار کی پامالی کا باعث نہ بننا چاہئے اور اہل ہوا و ہوس کو اسے اپنی خواہشات کا تختہ مشق نہ بنانا چاہئے تاکہ ''افتاء'' مذاق بن کر نہ رہ جائے۔

اس کا صحیح علاج ابو القاسم الصمیری محمد بن اسحاق (م ۲۷۵ھ) نے، ابوبکر خطیب بغدادی نے، ابو عمرو عثمان بن الصلاح نے، امام نووی نے شہاب الدین احمد بن ادریس القرافی نے، شمس الدین...... ابن القیم جوزیہ نے اور برہان الدین ابن فرحون نے تجویز کیا

ہے اسی طرح گیارہویں صدی ہجری کے بعض مشائخ جیسے ابراہیم اللقانی، منصور بن یونس البھوتی اور تیرہویں صدی کے بعض علماء جیسے محمد بن علی السنوسی نے اس کا حل تجویز کیا ہے۔ اسی طرح مختصر خلیل کے بعض شارحین جیسے الخطاب اور تحفہ ابن عاصم کے بعض شارحین جیسے التسوالی وغیرہ نے بھی اس موضوع پر لکھا ہے۔ یہ تمام مشائخ اس بات پر متفق ہیں کہ فتویٰ کے غلط استعمال و اصدار کے نتائج بہرحال خطرناک ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اس منصب پر ایسے ہی شخص کو فائز ہونا چاہیے جس کی علمی ثقاہت، فکری نزاہت نیز دین سے پختہ تعلق مسلم ہو۔

کار افتاء کی ذمہ داری کس پر ڈالی جائے؟

امام مالک کہتے ہیں کہ کسی عالم کو اس وقت تک فتویٰ دینے کا اختیار نہیں جب تک لوگ (اہل علم) اسے اس لائق قرار نہ دیں۔ یعنی اس کی اہلیت پر علماء صاد کریں اور وہ خود بھی اپنے آپ کو اس قابل سمجھتا ہو (۹) امام دارالہجرۃ امام مالک خود اپنے بارے میں کہتے ہیں میں نے اس وقت تک فتویٰ دینا شروع نہیں کیا جب تک کہ ستر (۷۰) جید علماء نے اس بات کی توثیق نہیں کی کہ میں اس کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ (۱۰)

المازری کہتے ہیں۔ ''قاضی کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی کو مفتی مقرر کرے بلکہ فقہاء ہی کسی کو یہ منصب سونپ سکتے ہیں۔ (۱۱)

خطیب بغدادی کہتے ہیں امام (حاکم) کو چاہیے کہ وہ مفتیوں کے ذاتی کردار کی اور علمی حیثیت کی چھان بین کرے پھر جسے اس قابل پائے اس کا تقرر کرے اور جس میں یہ صلاحیت نہ پائے اسے معزول کر دے بلکہ اس کو ڈرا بھی دے کہ بلا اہلیت وہ اس منصب تک دوبارہ پہنچا تو اسے سزا دی جائے گی رہا مسئلہ یہ کہ امام (حاکم) کس طرح صحیح مفتی کا انتخاب کرے تو اس کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ وہ ہم عصر علماء سے دریافت کرے اور ان میں سے ثقہ علماء کی رائے کو اختیار کرے۔'' (۱۲)

ابوالفرج ابن جوزی کہتے ہیں کہ ایسے لوگ جو فتویٰ دینے کے اہل نہ ہوں مگر مفتی بن بیٹھیں ان کے ساتھ وہی کرنا چاہیے جو بنوامیہ نے کیا کیونکہ یہ ایسے لوگ ہیں جنہیں خود تو

راستہ معلوم نہیں مگر سواروں کو راستہ و منزل بتاتے ہیں یا ان کی مثال ان لوگوں کی سی ہے، جنہیں طب کی ابجد تک معلوم نہیں مگر معالج بنے بیٹھے ہیں۔ بلکہ خود ساختہ مفتی تو ان تمام قسم کے لوگوں سے بدتر ہے اور جب ایک ایسے شخص کو علاج کرنے کی حکومت اجازت نہیں دیتی جو ماہر طبیب نہ ہو بلکہ صرف عطائی ہو تو پھر کسی ایسے شخص کو ''افتاء'' کی اجازت دینا جو کتاب و سنت کا عالم اور فقیہ نہ ہو سراسر ظلم و زیادتی ہے۔

اس موقف کی تائید اس حدیث رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بھی ہوتی ہے جس کے راوی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ہیں کہ:

> اللہ تعالیٰ علم کو یوں نہیں اٹھائے گا کہ علم ہی اچک لیا جائے بلکہ علم اس طرح اٹھایا جائے گا کہ کوئی عالم نہ رہے گا اور لوگ جاہلوں کو اپنا سردار بنانے لگیں گے جو بغیر علم کے لوگوں کے استفسارات کا جواب اور استفسارات پر فتویٰ جاری کرنے لگیں گے چنانچہ یہ خود گمراہ ہیں اوروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

حافظ ابن حجر نے اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے کہا کہ افتاء میں حقیقتاً سرداری ہے اور اس حدیث سے انہوں نے جاہل مفتیوں کی مذمت پر استدلال کیا ہے۔ بعض مشائخ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ جاہل قسم کے مفتیوں پر سخت برہم ہوتے یہاں تک کہ کسی نے ابن قیم سے ازراہ تمسخر کہہ دیا کہ کیا آپ مفتیوں کے محتسب ہیں؟ اس پر انہوں نے کہا، کیوں نہیں؟ اگر روٹی پکانے والوں اور باورچیوں پر محتسب مقرر ہو سکتا ہے تو مفتیوں پر محتسب کیوں نہیں ہو سکتا۔ (۱۳)

تحفہ ابن عاصم کے شارح شیخ التسولی کے زمانہ (۱۲۴۳ھ) میں ''المغرب'' میں احتیاطی تدابیر کے طور پر امام (حاکم) کو مفتیوں کی نگرانی و سرزنش کی ذمہ داری بھی سونپی گئی تھی۔ نظام قضاء پر جاہل مفتیوں کے فتاویٰ کے منفی اثرات کے پیش نظر افتاء عام پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ التسولی نے اس پابندی پر تنقید کی اور کہا کہ افتاء قضاء کی طرح فرض کفایہ ہے۔ (۱۴)

افتاء کی شرائط اور ممنوعات:

اس بات پر اصولیوں کا اجماع ہے کہ ثقہ و عادل عالم کو افتاء کا اختیار ہے جبکہ آئمہ اسلام نے ایسے شخص پر سخت ملامت کی ہے جو قلت علم یا ضعف دین یا دونوں کی موجودگی کے باوجود مسند افتاء پر چڑھ بیٹھے (۱۵) اور ایسے شخص کی شدید مذمت کی ہے جو بلا اہلیت میدان افتاء میں دم مارنے لگے اور لاعلمی کے باوجود فتاویٰ صادر کرنے لگے۔ یا خلاف علم اپنی خواہش یا کسی دوسرے کی خواہش کے مطابق فتاویٰ جاری کر دے یا سستی شہرت کی خاطر یوں فتویٰ دے کہ حلال کو حرام یا حرام و ناجائز کو حلال اور جائز بتلائے۔ یا کسی قول شاذ کو حجت قرار دے کر اس سے استدلال کرے اور اسی پر فتویٰ دے۔ مفتی کو یہ چاہئے کہ وہ سوال کا جواب دیتے وقت اس بات کا خیال رکھے کہ اس کا جواب یا اس کا حکم شرع میں اسی طرح ثابت شدہ ہے جیسا وہ کہہ رہا ہے۔ یوں مفتی کی حیثیت ''جبکہ اس کا تعلق مجتہدین سے ہو'' ایک ایسے مخبر کی ہو گی جو سائل کو قرآن و سنت سے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق کتاب و سنت ہی کا حکم سنا رہا ہو یا اس کی حیثیت ایسے مخبر کی ہو گی جو امام فی المذہب کی فقہی آراء و نصوص سے مسائل کے سوال کا جواب اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق دے یہ اس صورت میں ہے جبکہ اس کا تعلق مقلدین سے ہو جیسے کوئی مجتہد سوائے اس کے کوئی جواب نہیں دے سکتا جو اس نے کتاب و سنت سے سیکھا ہے اسی طرح کوئی مقلد اس کے سوا کوئی جواب نہیں دے سکتا جو اس نے اس امام فی المذہب کے مذہب سے سیکھا ہو جس کا وہ مقلد ہے۔

اس طرح جب کسی مفتی کو کسی استفتاء کے موضوع کے بارے میں مکمل معلومات مل جائیں اور وہ سوال کا حل یقین یا غلبہ ظن کی بناء پر نکال لے تو پھر اس پر لازم ہے کہ وہ اس کے مطابق جواب دے اور سوال کا صحیح حل مل جانے اور استفتاء کا درست جواب معلوم ہو جانے کے باوجود اس سے اغماض برتنا اور اس کے خلاف فتویٰ دینا حرام ہے ایسا کرنے والا شخص ان لوگوں کے زمرے میں شامل ہو گا جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ:

يَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَالَا يَعْلَمُوْنَ ۝

نیز

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ ...... اِلٰی قَوْلِہٖ تَعَالٰی وَ اَنْ تَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰہِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ ○ (الاعراف، ۳۳)

اور جب کسی نے علم کے خلاف فتویٰ دیا تو اس کا شمار ان لوگوں میں ہے جن کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے......

وَیَوْمَ الْقِیَامَۃِ تَرَی الَّذِیْنَ کَذَبُوْا عَلَی اللّٰہِ وُجُوْھُھُمْ مُّسْوَدَّۃٌ (الزمر، آیت ۶۰)

اگر کسی میں وصف علم بغیر عدالت کے پایا جائے تو اسے بھی فتویٰ دینا جائز نہیں۔ کیونکہ اس کے اور فتویٰ کے درمیان فسق حائل ہے اور وہ اس لئے کہ فتویٰ کا تعلق امور دینیہ سے ہے جبکہ فاسق کی بات امور دین میں قابل قبول نہیں۔ (۱۶)

بعض علماء کا کہنا ہے کہ یہاں فاسق سے مراد فاسق مُعلن اور مُبتدع ہے جس کا فتویٰ صحیح نہیں۔ (۱۷) جیسے روافض کہ جو سلفِ صالح پر سب وشتم کرتے ہیں چنانچہ ان کے فتاویٰ مردود ہیں اور ان کے اقوال ساقط الاعتبار ہیں۔ جیسا کہ نووی نے صیمری کا قول ''المجموع'' میں نقل کیا ہے۔ (۱۸)

اِفتاء و اِستِفتاء کا حکم:

ہر مسلم مرد وعورت کو ایسا کوئی بھی کام جو امور دین میں سے ہو شروع کرنے سے قبل سوچنا ہوگا کہ ان کا یہ عمل شرعاً حلال ہے یا حرام، جائز ہے یا ناجائز؟ اگر انہیں اس کا علم ہے تو فبہا اور اگر وہ اس کا شرعی حکم نہیں جانتے تو انہیں کسی ایسے صاحب علم سے رجوع کرنا ہوگا جو فتویٰ دینے کا اہل اور مجاز ہو، بتقضائے امر الٰہی:

فَاسْئَلُوْا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○ (النحل، آیت ۴۳)

اس کے بعد ہی مزعومہ امر کو کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اگر وہ امر شرعاً

جائز ہو تو اسے باطمینان قلب انجام دیا جائے گا اور اگر ممنوع یا ناجائز ہو تو اس سے اجتناب کیا جائے گا۔

اور جب کوئی مسلمان امور دینیہ کے سلسلہ میں کوئی سوال کسی ایسے عالم سے کرے کہ اس علاقہ میں اس کے سوا اور کوئی عالم نہ ہو تو اس عالم کو چاہئے کہ وہ پوری احتیاط کے ساتھ ادلہ شرعیہ کے مقتضی کے عین مطابق اس سوال کا جواب دے کہ ایسا کرنا شرعاً اس پر واجب ہے اور اگر اس علاقہ میں ایک سے زائد ایسے علماء ایک ہی مجلس میں موجود ہوں جو فتویٰ دینے کے اہل ہوں تو اب ان تمام پر اس کا جواب دینا فرض کفایہ ہے کہ ان میں سے اگر ایک بھی یہ ذمہ داری قبول کر لے تو تمام پر سے وجوب ساقط ہو جائے گا جیسا کہ دیگر فرائض کفایہ میں معروف ہے۔ لیکن اگر سائل کو ان میں سے صرف ایک ہی مفتی دستیاب ہو تو اس ایک پر اس کا جواب دینا فرض عین ہے۔

اور اگر سائل کے علاقہ میں صرف ایک متفقہ پایا جائے جو کہ مفتی نہ ہو اور اس میں مفتی ہونے کی استعداد (Ability) نہ ہو اور سائل کو باوجود تلاش بسیار کے کوئی مفتی نہ مل سکے تو اسے اس صورت میں اسی متفقہ سے رجوع کرنا ہوگا اور اسی سے مسئلہ کا حل طلب کرنا ہوگا کہ ایسا کرنا کم از کم اس سے بہتر ہے کہ وہ بغیر شرعی حکم معلوم کئے شک و ارتیاب کے عالم میں کسی امر پر عمل پیرا ہو اور سائل کا مسئلہ کے حل کے سلسلہ میں کوشش و کاوش کرنا باوجودیکہ اسے کوئی اہل علم نہ ملے، یہ بھی تقویٰ کی وہ حد ہے جسے اللہ نے فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ فرمایا ہے۔ (۲۰)

اور اگر مستفتی پر کسی ایسی جگہ کوئی افتاد آن پڑی کہ جہاں نہ تو کوئی مفتی، مجتہد ہے اور نہ مقلد، تو ایسی صورت میں اس سے اس افتاء کا شرعی حکم معلوم کرنے کی ذمہ داری ساقط ہو جائے گی اور یہ اس شخص کی مانند ہو گا جسے دعوت نہیں پہنچی۔ اگرچہ یہ دوسروں کی نسبت زیادہ مکلف ہے تاہم اسے اپنے ضمیر سے پوچھنا چاہئے کہ فطرت سلیمہ اور ضمیر زندہ اسے حق کی طرف رہنمائی کریں گے۔ (۲۱)

بعض علماء نے صراحت کی ہے کہ اگر کوئی عالم اس مخصوص صورت حال کا شرعی حکم نہ جانتا ہو جس سے سائل دوچار ہوا ہے تو عالم کو چاہئے کہ وہ مستفتی کے سوال کا جواب نہ

۷۔ یہ اس صورت میں ہے جبکہ واقعتاً استفسار کسی ایسی صورت سے متعلق ہو جو کہ حقیقتاً درپیش ہو مگر عموماً پیش نہ آتی ہو نہ کہ فقط کسی صورت کے امکانات سے متعلق ہو یا ناممکن الوقوع مسائل سے متعلق استفسار ہو۔ امام مالک سے بسا اوقات بعض مسائل کے بارے میں سوال کیا جاتا تو آپ فرماتے کیا یہ امر واقعتاً درپیش ہے؟ اگر کہا جاتا کہ ہاں تو جواب دیتے بصورت دیگر جواب نہ دیتے تھے اور یہ کہہ کر اسے چھوڑ دیتے کہ جب کوئی ایسی صورت پیش آئے گی تو اللہ تعالیٰ جواب بھی ارزاں فرما دیں گے۔ (۴۲)

مفتی کی خوبیاں:

مفتی کا منصب امور دین میں ایک اہم منصب اور حساس اجتماعی فریضہ اور سوشل ذمہ داری ہے جس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے حقیقی استعداد اور ظاہری و باطنی صفات سے متصف ہونا لازمی ہے۔

۱۔ مفتی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اعلیٰ کردار کا مالک اور فسق و فجور کا باعث بننے والے امور سے کلیتاً مجتنب ہو۔

۲۔ عوام الناس کے نزدیک اس کی شہرت عمدہ ہو، حق پر ثابت قدم رہنے والا اور نرمی کے موقع پر نرمی اور سختی کے موقع پر سختی کرنے والا ہو۔

۳۔ بارعب اور پروقار شخصیت کا مالک ہو۔

۴۔ صاحب بصیرت، سلیم العقل اور استنباط مسائل میں حسن تصرف کا مالک ہو۔

۵۔ لوگوں کے احوال سے واقف ہو اور ان کے مکر و فریب کو جانتا ہو تا کہ حق و باطل کی تمیز کر سکے اور ظالم و مظلوم کو پہچان سکے۔

۶۔ وہ صرف اپنے ہی علم پر تکیہ کرنے والا نہ ہو بلکہ اپنے ہم مجلسوں سے مشورہ بھی کرتا ہو اگرچہ اس کے ہم مجلس اس سے علم میں نسبتاً کم ہوں۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ اس طرح کوئی ایسی صورت اس پر ظاہر ہو جائے جو اس وقت اس کے ذہن سے اوجھل ہو اور مشورہ کر لینا سلف صالحین کی اتباع بھی ہے۔ ماسوا ان امور کے جن کا پوشیدہ رکھنا مطلوب ہو یا جن کے افشاء سے فساد کا خطرہ ہو یا آداب معاشرت کے خلاف لازم آتا ہو۔

۷۔ اسے اپنے علم اور مفتی کے اعلیٰ منصب پر فائز ہونے کا گھمنڈ نہ ہو بلکہ وہ امور مسئولہ میں اللہ علیم وخبیر سے مدد ونصرت کا طلبگار رہے اور یہ التجا کرتا رہے کہ رب کریم اسے مسئلہ کے صحیح ترین حل تک پہنچنے میں رہنمائی فرمائے۔ ابن قیم کہتے ہیں وہ جب بھی اللہ کے دروازے پر دستک دے گا تو گویا توفیق کا دروازہ کھٹکھٹائے گا۔ (۲۳)

۸۔ لباس و پوشاک میں نظامت پسند ہو۔ کبھی بھی غیر شرعی وضع قطع کے ساتھ گھر سے نہ نکلے، القرافی کہتے ہیں کہ عامۃ الناس ظاہری شکل وصورت، وضع قطع کا بہت اثر لیتے ہیں اور اگر مفتی کا وقار واحترام ان کے دل میں نہ ہوگا تو وہ نہ تو اس کے فتاویٰ کو اہمیت دیں گے اور نہ شرعی مسائل کے سلسلے میں اس سے رجوع ہوں گے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں ایک ایسے قاری کو پسند کرتا ہوں جو سفید لباس میں ملبوس ہوتا کہ وہ لوگوں کی نظروں میں باوقار ٹھہرے اور یوں جو کچھ علوم حقہ میں سے اس کے پاس ہے اس کی بھی قدر ومنزلت ہو۔ (۲۴)

ابو عبداللہ ابن بطہ اپنی کتاب ''الخلع'' میں امام احمد بن حنبل سے روایت کرتے ہیں کہ امام احمد فرماتے تھے کہ کوئی شخص منصب مفتی کا اہل نہیں جب تک اس میں پانچ خوبیاں نہ ہوں:

۱۔ نیک نیت ہو۔

۲۔ اس میں علم وحلم اور وقار وسکون ہو۔

۳۔ علم میں پختہ اور عزم میں قوی ہو۔

۴۔ ہیبت ووقار ہو ورنہ عوام اسے چبا ڈالیں گے۔

۵۔ لوگوں کے احوال سے واقفیت رکھتا ہو۔

ان خوبیوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ابن قیم کہتے ہیں کہ یہ پانچ خوبیاں مفتی کی اصل اور اساس ہیں، ان میں سے کوئی بھی کم ہوگی تو مفتی میں اسی حساب سے اتنی ہی کمی یا نقص پایا جائے گا۔

فتویٰ کے سلسلہ میں مفتی کو کیا کیا کوششیں کرنی چاہئیں:

مفتی کے پاس جیسے ہی کوئی سوال آئے تو اسے اس کا جواب دینے میں جلد بازی

کا مظاہرہ نہ کرنا چاہئے بلکہ اس کے اور مستفتی کے مفاد میں یہ ہے کہ مفتی اس سوال پر خوب غور و فکر کے لئے کافی وقت دے اور اس کے تمام اجزاء و عناصر پر اول سے آخر تک گہری نظر ڈالے تاکہ فتویٰ دینے میں کہیں کوئی تساہل اس سے منسوب کر کے اسے لاپرواہوں کی صف میں اور ایسے لوگوں کے زمرے میں اسے شامل نہ کر دیا جائے جن کے فتاویٰ لائق اعتبار نہیں چنانچہ اسے مندرجہ ذیل کوششیں فتویٰ دیتے وقت کرنی چاہئیں۔

۱۔ فتویٰ تحریر کرنے سے قبل مستفتی کے سوال کو غور سے پڑھا جائے اور اس کے الفاظ پر غور کر کے جواب اسی کے الفاظ کے مطابق لکھا جائے کیونکہ مستفتی اگر پڑھا لکھا نہیں تو اس کے الفاظ کا صحیح مفہوم ممکن ہے مفتی سرسری نظر سے نہ جان سکے یا یہ کہ جو الفاظ سائل نے استعمال کئے ہیں عرف عام میں ان کا مفہوم کچھ اور ہوتا ہو۔ چنانچہ مفتی کو جواب میں ایسے ہی الفاظ استعمال کرنے چاہئیں جو معروف ہوں اور جن سے سوال کا واضح اور صحیح جواب مستفتی کی سمجھ میں آسکے اور اگر مفتی بلاغور و خوض اور الفاظ میں تامل کے بغیر فتویٰ نویسی شروع کر دے گا تو یہ فتویٰ خلاف شرع ہوگا مستفتی کا مافی الضمیر سمجھے بغیر لکھا گیا۔ (۲۵)

۲۔ مفتی کا جواب خلاف واقع نہ ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ مفتی سائل سے اس کے شہر یا گاؤں کے بارے میں معلومات حاصل کرے اور جواب اسی کے شہر و گاؤں کے عرف کے مطابق دے کہ مختلف علاقوں میں عرف مختلف ہو سکتے ہیں لہٰذا مفتی عرف کا لحاظ رکھے اور اپنے ہی شہر کے عرف کے مطابق فتویٰ نہ دے کہ ہر شہر کا عرف خاص حکم شرعی رکھتا ہے۔ (۲۶)

۳۔ جواب مستفتی کی غرض و غایت سمجھنے کے بعد لکھا جائے اور تفصیلات جاننے کے لئے اس سے استفسار کیا جائے تاکہ موضوع کی وضاحت ہو سکے اور اگر موضوع کی تفصیلات جاننا ضروری ہوں تو یہ تفصیلات جاننے کے بعد ہی جواب تحریر کیا جائے تاکہ ہر طرح کے احتمالات و اشکالات سے پاک جواب لکھا جا سکے۔ (۲۷)

۴۔ مفتی کا جواب حق و صواب کے مطابق ہو تاکہ مستفتی کو اس کے نتیجہ میں کسی ملامت و عتاب کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ مفتی کو سوال کی اچھی طرح چھان پھٹک کرنی چاہئے

کیونکہ ہر سائل کی نیت واقعتاً اس کا جواب حاصل کرنے کی نہیں ہوتی بلکہ ایسے سا
بھی آجاتے ہیں جو اس سوال کے جواب کے نتیجہ میں اپنا کوئی اور الو سیدھا کرنا چا
ہیں۔ یا مفتی کو الجھانا مقصود ہوتا ہے یا اس کے ذریعہ اپنے دیگر مقاصد کی تکمیل مق
ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر سائل کے سوال کو حسن نیت پر بھی محمول نہیں کیا جا سکتا۔ م
اگر ان امور کا خیال کئے بغیر فتویٰ دے گا تو خود بھی گرفتار بلا ہوگا اور دوسروں کو
مبتلائے عذاب کریگا۔ اس صورتحال کو حسب ذیل مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ (۲۸)

کبھی مفتی کے پاس ایسا سوال بھی آسکتا ہے جو دو ایسے مسائل پر مشتمل ہو کہ ج
کی صورت ایک جیسی ہو مگر حکم مختلف ہو اور یوں ان میں سے ایک تو صحیح و جائز کے قبیل
ہو جبکہ دوسرا باطل و حرام کے قبیل سے اور اس کی وجہ پہلے اور دوسرے مسئلہ کی حقیقت
اختلاف پایا جاتا ہو۔ اب اگر مفتی ذہانت سے کام نہ لے اور اس کی نظر صرف ایک ہی صور
پر ہو تو وہ ان دونوں کی حقیقت سے تجاہل کی بناء پر دونوں پر ایک ہی حکم لگائے گا اور یوں
صحیح کے مخالف فتویٰ دے ڈالے گا کیونکہ اس نے ان دو امور کو جمع کر دیا جن میں اللہ
فرق رکھا ہے۔

کبھی مفتی کے پاس ایسا سوال آسکتا ہے جو دو ایسے مسائل پر مشتمل ہو کہ جن
صورت مختلف ہو مگر حکم ایک ہی ہو کہ دراصل ان کی حقیقت ایک ہی ہے اور اگر مفتی ذہان
سے کام نہ لے اور اس کی نظر ایک ہی صورت پر ہو اور وہ دونوں مسائل کو نفس حقیقت می
ایک سا نہ سمجھ سکے تو وہ ایک مسئلہ پر ایک حکم اور دوسرے پر دوسرا حکم لگائے گا۔

کبھی مفتی کے سامنے ایسا سوال بھی آسکتا ہے جو مجمل ہو مگر اس کے اجمال میں
متعدد انواع ہوں چنانچہ مفتی کا ذہن کسی مخصوص نوع کی طرف جا سکتا ہے اور کسی دوسری نو
سے اس کا ذہن غافل بھی رہ سکتا ہے اور ممکن ہے وہی نوع مستفتی کے نزدیک زیادہ اہم او
مقصود بالذات ہو۔ چنانچہ اگر مفتی اجمال کی تفصیل جانے بغیر فتویٰ دے گا اور ابتداء ہی میں
سائل کا قصد معلوم کرنے کی کوشش نہ کرے گا تو جواب تحریر کرنے میں وہ کسی ایسی صورت ک
اختیار کر سکتا ہے جو صواب سے دور تر ہو۔

اس سے بھی بڑھ کر ایک صورت مفتی کو پیش آسکتی ہے اور وہ یہ کہ مفتی کے سامنے ایک ایسا سوال آئے جو اصلاً باطل ہو مگر خوب صورت الفاظ اور شگفتہ تحریر کے لبادے میں پیش کیا گیا ہو۔ (۲۹) اور اگر مفتی اس مکروفریب کی طرف متوجہ نہ ہو جو اس میں ملفوف ہے اور جواب دینے میں جلدی کرے تو وہ محذورات میں جا پڑے گا۔

ایسے ہی موقع کی مناسبت سے القرافی نے کہا کہ مفتی کو بہت چوکنا رہنا چاہئے کیونکہ بسا اوقات باطل کو حق کے انداز میں بیان کیا جاتا ہے مگر اس سے اصلاً مقصود باطل ہوتا ہے۔ (۳۰)

مفتی ہوشیار باش:

مفتی کی زندگی میں بعض مواقع ایسے بھی آتے ہیں جہاں اس کے پھسل جانے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا مفتی کو ایسی پھسلن (Slipping) سے ہوشیار رہنا چاہئے۔ مثلاً اگر کسی مسئلہ میں دو قول ہوں۔ ایک قول تخفیف (نرمی) کا اور دوسرا تشدید (سختی) کا تو مفتی کو شدت کے قول پر فتویٰ نہ دینا چاہئے اسی طرح عوام کو تشدید کے قول پر اور خواص کو تخفیف کے قول پر فتویٰ دینا بھی درست نہیں جبکہ اس کے پاس ایسا کرنے کا کوئی شرعی جواز بھی نہ ہو۔ (۳۱) کیونکہ ایسا کرنا ایک طرح کا فسق ہے پھر دین میں خیانت بھی ہے اور مسلمانوں سے دھوکہ بھی۔ (۳۲) اسی طرح مفتی کو باطل شبہات کی بناء پر اپنی فاسد اغراض کے پیش نظر فتویٰ نہ دینا چاہئے اور نہ ہی ذاتی منفعت کی خاطر حرام و مکروہ قسم کے حیلے بہانوں سے تخفیف کرنی چاہئے۔

اسی طرح اسے کسی ایسے شخص کو مشکل اور تنگی میں نہ ڈالنا چاہئے جس سے اسے کبھی نقصان پہنچا ہو، گویا مفتی کو یوں اپنے منصب سے گر کر فتویٰ نہ دینا چاہئے ہاں مگر جو اپنے دین و ایمان کو اتنا ہی حقیر و کمتر جانے تو وہ اس قسم کی حرکت کر گزرے گا مگر اس کے بعد فتویٰ دینے کا مطلقاً مجاز نہ ہو گا۔ (۳۳)

اگر کسی ایک مسئلہ میں متعدد اقوال ہوں اور مفتی میں ان اقوال میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے کی استعداد نہ ہو تو اسے یونہی اندازے سے فتویٰ دینے کا حق نہیں کہ وہ جسے چاہے جس قول کے مطابق فتویٰ دے ڈالے کیونکہ اسے شرعاً یہ حق نہیں کہ وہ اپنی منفعت اور ذاتی

پسند ناپسند کو مختلف اقوال میں معیار ترجیح ٹھہرائے اور اپنے پسندیدہ افراد یا دوست احباب کو تو اس قول کے مطابق فتویٰ دے جس سے اس کی غرض پوری ہو جائے اور دیگر لوگوں یا مخالفین کو اس کے برعکس قول کے مطابق فتویٰ دے تاکہ انہیں ضرر اور نقصان پہنچے۔

قاضی ابو الولید باجی اپنے دور کے ایک مفتی (جو کہ اپنی منشاء و مرضی کے مطابق فتویٰ دیا کرتا تھا) کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں ''دراصل اسلام میں اس سلسلہ میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ اس پر اجماع ہے کہ اس طرح فتویٰ دینا جائز نہیں'' کیونکہ یہ تو شریعت سے مذاق ہوگا اور اس پر اصرار کرنا یا قائم رہنا بدتر فسق اور اکبر الکبائر گناہ ہے۔ (۳۴) ہاں اگر مفتی کسی شرعی مصلحت کی بناء پر سائل کو ایسا فتویٰ دے جس میں شدت ہو اور اس کے پاس اس کی تاویل بھی ہو تو تادیب و تنبیہ کے اعتبار سے جائز ہے۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ان سے کسی نے قاتل کی توبہ کے قبول ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ قاتل کی توبہ قبول نہیں ہوتی جبکہ ایک اور شخص نے یہی سوال کیا تو آپ نے فرمایا ہاں اس کی توبہ قبول ہوتی ہے۔ پھر آپ نے اپنے دونوں اقوال پر مبنی دو مختلف و متعارض جوابات کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: پہلا شخص جسے میں نے کہا کہ قاتل کی توبہ قبول نہیں ہوتی اس کی آنکھوں سے ارادہ قتل ٹپک رہا تھا سو میں نے اسے قتل سے باز رکھنے کی غرض سے یہ کہا۔ جبکہ دوسرا قتل کرنے کے بعد نادم ہو کر مسئلہ دریافت کرنے آیا تھا تو میں نے اسے اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں کیا۔ (۳۵)

مفتی کو چاہئے کہ جب اس کے اخلاق میں تبدیلی اور مزاج میں حد اعتدال سے تجاوز آ جائے جیسا کہ گھریلو معاملات و تفکرات کی بناء پر ہونا ممکن ہے تو وہ ایسے حالات میں فتویٰ نہ دیا کرے ہاں اگر وہ خارجی عناصر کو اپنے اوپر اثر انداز نہ ہونے دے تو ایسی صورت میں اس کے فتویٰ دیتے رہنے میں کوئی حرج نہیں۔ (۳۶)

مفتی کو چاہئے کہ وہ منصب افتاء سنبھالنے سے پہلے اس بات کا اطمینان کرلے کہ اس کے پاس اپنی ضروریات زندگی کے لئے بقدر کفایت سامان بود و باش ہے؟ بصورت دیگر لوگ اس کی معاشی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے اور مال و دولت کا

لالچ دے کر اسے اپنے دباؤ میں لے آئیں گے چنانچہ وہ لوگوں کے لئے تر نوالہ ثابت ہوگا اور اس مال کا خواہش مندر ہے گا جو اوروں کے پاس ہے۔

مفتی کو چاہئے کہ وہ اپنے گزر بسر کا اہتمام دیگر جائز ذرائع آمدن سے کرے اور فتویٰ کا کام محض فی سبیل اللہ انجام دے۔ مفتی کو چاہئے کہ اگر اس کے پاس بقدر کفایت سامان زیست نہ ہو تو حاکم سے وظیفہ قبول کرے اور حاکم کو چاہئے کہ وہ مفتی کا وظیفہ مقرر کرے تا کہ اس سے اس کی ذاتی ضروریات پوری ہوسکیں۔ (۳۷) اور وہ اس وظیفہ کے عوض افتاء کی خدمات انجام دے سکے جو کہ فرض کفایہ بھی ہے اور مصالح عامہ میں سے ایک اہم ضرورت بھی۔

حافظ ابوبکر خطیب بغدادی نے اپنی کتاب الفقیہ میں لکھا ہے کہ "حاکم کو چاہئے کہ وہ تدریس فقہ اور منصب افتاء پر فائز اشخاص کے وظیفہ کا انتظام کرے تا کہ انہیں اپنی ضروریات کے لئے کوئی کاروبار نہ کرنا پڑے۔ مفتی کا وظیفہ بیت المال سے مقرر کیا جانا چاہئے۔" پھر خطیب بغدادی نے اپنی سند سے ایک روایت نقل کی ہے کہتے ہیں کہ "حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس قسم کی خدمات انجام دینے والے ہر شخص کو سو (۱۰۰) دینار سالانہ وظیفہ دیا کرتے تھے۔ (۳۸)

مفتی سے فتویٰ حاصل کرنے کے مقاصد

جب کوئی سائل یا مستفتی کسی مفتی سے کوئی سوال کرتا ہے تو اس کا یہ سوال تین حالتوں میں سے کسی ایک حالت سے خالی نہیں ہوتا۔

۱۔ سوال کا مقصد کسی مسئلہ میں واقعتاً اللہ اور اس کے رسول کا حکم معلوم کرنا ہوتا ہے۔

۲۔ یہ جاننے کی کوشش کرنا کہ مفتی صاحب کا مسلک کیا ہے اور وہ کس امام کے مقلد یا پیروکار ہیں۔

۳۔ یہ معلوم کرنا کہ مفتی صاحب صورت مسئولہ میں اپنے امام مذہب کے قول کو ترجیح دیتے ہیں یا اپنی رائے کو۔

پہلی صورت میں مفتی کی ذمہ داری یہ ہے کہ اگر وہ جانتا ہو اور اسے یقین ہو کہ جو

کچھ وہ جواب دے رہا ہے درست ہے تو وہ سائل یا مستفتی کو اللہ اور اس کے رسول کے حکم سے جواب دے کہ اس کے بغیر اس کے پاس چارہ کار نہیں۔

دوسری صورت میں مفتی کی ذمہ داری یہ ہے کہ مفتی اپنے اس امام مذہب کے قول کے مطابق فتویٰ دے جس کا کہ وہ مقلد یا پیروکار ہے اور اس بات کا اطمینان کرلے کہ جو قول وہ نقل کر رہا ہے وہ واقعی اس امام کا ہے بھی یا نہیں اور یہ کہ آیا وہ قول اس امام کا واقعی مذہب مشہور ہے یا نہیں۔

تیسری صورت میں مفتی کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ سائل کو ایسا جواب دے جو پوری محنت اور کوشش کے ساتھ کی گئی تحقیق کے بعد اس کے نزدیک راجح قرار پائے اور جس کے بارے میں اسے اطمینان ہو جائے کہ یہی صحیح ترین جواب ہے اب اس صورت میں یہ سائل پر لازم نہیں آئے گا کہ اس نے محض قول مفتی پر اعتماد کیا بلکہ اسے فتویٰ پر عمل کرنے میں خوشی محسوس ہوگی کہ یہ خلاصہ تحقیق ہے۔ (۳۹)

مفتی کی بصیرت کا تقاضا یہ ہے کہ جب اس سے کوئی مستفتی کسی چیز کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں سوال کرے تو مفتی کو چاہئے کہ اگر وہ حرمت کا فتویٰ دے رہا ہو تو اس کے ساتھ وہ یہ بھی بتا دے کہ اس کے مقابل حلال اور جائز امر کیا ہے تا کہ جب سائل پر ممنوع و ناجائز کا دروازہ بند ہو ساتھ ہی جائز اور مباح کا دروازہ کھل جائے ابن القیم کہتے ہیں ''اس طرح کا عمل کوئی زیرک اور شفیق عالم ہی کر سکتا ہے جسے منجانب اللہ توفیق نصیب ہو، اللہ اس کے نصیحت کرنے اور اس کی نصیحت پر عمل پیرا ہونے والے کو اجر عطا فرمائے'' علماء میں اس طرح کا عالم ایک طبیب حاذق کی مانند ہے کہ جو مریض کو ایسی اشیاء کے استعمال سے روکتا ہے جو نقصان دہ ہوں اور ایسی اشیاء کے استعمال کی ہدایت دیتا ہے جو مفید ہوں۔ (۴۰)

ابو البقاء الحسینی کہتے ہیں کہ ''جہاں تک علم وارشاد کا تعلق ہے تو معلم کا فرض ہے کہ وہ اس معاملہ میں ایک طبیب کی مانند ہو جو مریض کو شفایاب کرنے کے سلسلہ میں سرتوڑ کوشش کرتا ہے اور ایسا نسخہ اور علاج تجویز کرتا ہے جو مرض کے مطابق ہو نہ کہ مریض کے بتانے کے موافق۔'' (۴۱)

آداب سوال وسائل:

مستفتی کو ایسی حالت میں مفتی سے سوال نہ کرنا چاہئے جب مفتی پریشان ہو یا کسی کام کو جانے کے لئے تیار ہو یا کسی سوچ اور خیال میں گم ہو، کیونکہ ایسی صورت میں وہ سائل کے سوال پر پوری توجہ نہ دے پائے گا اور نہ ہی صحیح طور پر جواب دے سکے گا۔ (۴۲)

مستفتی کو کوئی ایسا مسئلہ دریافت نہ کرنا چاہئے جو فی الواقع پیش ہی نہ آیا ہو یا نادر الوقوع ہو یا دور از کار ہو۔ اسی طرح ایک عام مستفتی کو کسی ایسی چیز کے بارے میں نہ پوچھنا چاہئے جو اس کے فہم و ادراک سے بالاتر ہو اور اگر وہ اس قسم کے سوالات میں الجھے الجھائے تو مفتی کو چاہئے کہ وہ اس کے سوال سے صرف نظر (Ignore) کرے اور اسے کوئی جواب نہ دے۔ ہاں اگر مستفتی کا مقصد اس سوال سے ایسے معاملات کا علم حاصل کرنا ہو جو اسے پیش نہیں آئے مگر وہ انہیں تحصیل علم و تفقہ کی نیت سے اور اس خیال سے جاننا چاہتا ہے کہ جب کبھی اس طرح کے معاملات پیش آئیں تو پہلے ہی سے وہ جواب جانتا ہو یا اس سے ملتے جلتے مسائل پر ان جوابات کا اطلاق کر سکے تو ایسے مستفتی کو کافی وشافی جواب دیا جائے گا۔

اگر سوال کا سبب پیچیدہ مسائل یا متشابہات ہوں جس سے مستفتی کے ذہن میں شبہات نے جنم لیا ہو تو اس صورت میں مفتی کو چاہئے کہ وہ انتہائی شفقت سے مستفتی کا ذہن صاف کرے اور ایسا اسلوب اختیار کرے جو مستفتی کے ذہن اور عقل کو اپیل کرے کیونکہ مخلوق خدا کی ہدایت اہل علم پر فرض ہے جیسا کہ القرافی نے کہا کہ ''جہاں کہیں بھی جواب کی مصلحت راجح ہو وہی اولی ہے جیسا کہ ابن القیم نے کہا ہے۔ (۴۳)

سوال کیسے (Put - Up) کیا جائے؟

اگر مستفتی پر کوئی آفت ایسی آن پڑے جس کا حل وہ شریعت کے حکم سے چاہتا ہو اور اس کے شہر میں کئی مفتی ہوں اور وہ تمام مفتیوں کے جوابات ایک ہی کاغذ پر حاصل کرنا چاہے تو اسے چاہئے کہ وہ ایک بڑے سائز کا کاغذ لے جس پر تمام مفتیوں کے جوابات لکھے جاسکیں۔ پھر ادب واحترام کا تقاضا یہ ہے کہ وہ جواب کے سلسلہ میں سب سے پہلے عمر رسیدہ

اور جہاں دیدہ صاحب علم سے رجوع کرے پھر ان کے بعد درجہ بدرجہ دیگر مفتی صاحبان کے پاس اپنا سوال لے جائے اور اگر وہ متعدد کاغذوں پر مختلف مفتیوں کی آراء و فتاویٰ حاصل کرنا چاہتا ہو تو پھر سوال کی نقول جسے چاہے پہلے بھیج دے اور جس کے پاس چاہے بعد میں لے جائے البتہ کاغذ اتنا بڑا ہو کہ سوال کے بعد اس پر مفتی مکمل فتویٰ تحریر کر سکے۔

سائل یا مستفتی کو چاہئے کہ وہ اپنا سوال اس انداز سے لکھے کہ اس سے اس کا مطلب پوری طرح واضح ہو اور جس مقصد کے لئے اس نے سوال لکھا ہے وہ پورا ہو سکے۔ اسی طرح الفاظ واضح اور جلی قلم سے لکھے ہوں ان میں کوئی پیچیدگی اور ہیر پھیر نہ ہو۔ اگر سائل ایک عام سا شخص ہو تو اسے چاہئے کہ وہ اپنا سوال کسی ایسے شخص سے لکھوائے جو پڑھا لکھا ہو تاکہ سوال خوش اسلوبی سے لکھا اور پیش کیا جا سکے۔ (۴۴)

جواب کیسے مرتب کیا جائے:

سائل کے سوال کی حدود اور حاجت کے مطابق جواب دیا جائے اور سوال کی عبارت میں کوئی اضافہ کیا جائے نہ اس کے موضوع میں۔ جواب مختلف اقوال اور اختلاف کے ذکر سے خالی ہونا چاہئے کیونکہ مختلف اقوال ذکر کرنے سے مستفتی کے ذہن میں تشویش پیدا ہوگی اور وہ یہ نہ سمجھ سکے گا کہ کس قول پر عمل کرے۔ جواب دوٹوک، واضح اور حصول مقصد کے لئے کافی ہونا چاہئے کہ اس کے ساتھ کسی اور بات کی ضرورت نہ رہے۔ (۴۵) اگر مستفتی نے صرف رہنمائی کی خاطر سوال کیا ہو تو اس کے سوال کا صرف مختصر جواب ہی کافی ہوگا اس کے ساتھ دلائل اور حوالہ جات نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں اگر یہ توقع ہو کہ جواب پر اعتراض یا اشکال وارد ہو گا تو پھر دلائل اور حوالہ جات جواب کے اندر ہی ذکر کرنے چاہئیں تاکہ جو کوئی حقیقت امر جاننا چاہے وہ حق اور صواب جان لے۔ (۴۶) الضیمری نے کہا ہے:

> ''اگر کوئی عام آدمی سائل ہو تو دلیل ذکر کرنے کی ضرورت نہیں اور اگر کوئی پڑھا لکھا سوال کرے تو دلیل ذکر کردی جائے۔'' (۴۷)

القرافی نے کہا ہے کہ جب استفتاء کسی بڑے واقعہ سے متعلق ہو جو دین کے کسی

اہم معاملہ یا مسلمانوں کے مفاد سے تعلق رکھتا ہو تو مفتی کو چاہئے کہ وہ مفصل جواب لکھے اور حق واضح کرنے کیلئے مبالغہ سے کام لے اور فوراً سمجھ میں آنے والے دلائل ذکر کرے تا کہ فوائد حاصل اور مفاسد دور ہوں اور ایسے دلائل ذکر کئے جائیں جو شرعی و قانونی مفادات کو تحفظ فراہم کریں۔ مذکورہ صورت کے علاوہ اس قسم کے جواب لکھنے کی ضرورت نہیں۔(۴۸)

ابن القیم کہتے ہیں کہ:

''جواب میں دلیل اور اس کے حوالہ جات کا حتی الامکان ذکر ہونا چاہئے اور مستفتی کو بالکل روکھا، پھیکا اور بلادلیل و حوالہ فتویٰ نہ دینا چاہئے۔''

اس رائے پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض فتاویٰ سے استدلال کیا گیا ہے۔(۴۹)

ابن القیم کا کہنا ہے کہ:

''مفتی کو سائل کے سوال سے زیادہ جواب دینا جائز ہے۔'' (۵۰)

اورانہوں نے اس پر صحیح بخاری کے ایک ترجمۃ الباب سے استدلال کیا ہے جو حسب ذیل ہے۔

بَاب مَنْ اَجَابَ السَّائِل باکثر مِمَّا سُئِلَ عَنْہ۔

یعنی ''سائل کو سوال سے زیادہ جواب دینا۔''

رہا معاملہ یہ کہ جواب کیسے لکھا جائے تو پہلی بات تو یہ ہے کہ جواب لکھتے وقت یہ خیال رکھا جانا ضروری ہے کہ جواب میں کسی اور کی طرف سے کسی اضافہ کی گنجائش نہ چھوڑی جائے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ کوئی اور شخص اس جواب میں اپنی طرف سے ایسا اضافہ کر دے جو اس جواب کے برعکس ہو یا گمراہ کن ہو۔ چنانچہ جواب کی تحریر میں نہ تو بین السطور کی کوئی جگہ چھوڑی جائے اور نہ کوئی نقص رہنے دیا جائے اور مفتی کو ایک ہی قلم اور خط سے فتویٰ تحریر کرنا چاہئے کیونکہ خط بدلنے یا قلم بدلنے سے کسی کو فتویٰ میں جعل سازی و تزویر کا موقعہ مل سکتا ہے۔ خط واضح ہونا چاہئے نہ زیادہ باریک نہ زیادہ بڑا کہ پڑھنے والے کو دشواری ہو یا ناگوار گزرے۔(۵۱)

القرافی کہتے ہیں کہ:

''اس طرح کی احتیاطی تدابیر کرنا ضروری ہے اور کسی قسم کی بدظنی، جعل سازی وغیرہ کے راستے مسدود کرنا عمدہ اسلوب ہے کہ نبی اکرمؐ کا ارشادگرامی ہے کہ:

''دَعْ مَا یُرِیْبُکَ اِلٰی مَا لَا یُرِیْبُکَ۔ (۵۲)

مفتی کسی قسم کا اضافہ کرسکتا ہے؟

اگر مستفتی یا سائل کا سوال ایسا عجب ہو کہ جو غیر مانوس سا ہو تو مفتی کو یہ حق نہیں کہ وہ ایک دم سے سائل کو ٹکا سا جواب دے دے بلکہ اسے چاہئے کہ وہ پہلے مقدمہ کے طور پر تمہید باندھے تاکہ سائل جواب سمجھنے اور اسے قبول کرنے کی پوزیشن میں آجائے اور اس جواب پر عمل کرنے کو ذہنی طور پر تیار ہو جائے۔ (۵۳) اگر سوال کا جواب اسا ہو کہ جس سے سائل کے غلط فہمی میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو تو مفتی کو چاہئے کہ وہ سائل کو متنبہ (خبردار) کرے تاکہ اس کا خیال اور ذہن غلط فہمی کی جانب نہ جائے۔ (۵۴) اگر سائل کے سوال میں کسی نص قرآن وسنت کا حوالہ دیا گیا ہو تو مفتی کو چاہئے کہ وہ اپنے فتویٰ میں بھی اس نص کو نقل کرے اور جہاں تک ممکن ہو نص کے الفاظ ذکر کرے کیونکہ جو نص بھی شارع کے حوالہ سے ذکر ہوئی ہوگی اس میں کسی حکم کا بیان ہوگا۔ علاوہ ازیں اس میں حکم اور دلیل مذکور ہوں گے جو کہ موقع کی مناسبت سے ہوں گے اور ظاہر ہے کہ کسی بھی موضوع پر مذکور نص خطاء، تناقض اور اضطراب سے پاک ہوتی ہے۔ (۵۵)

اگر سائل نے کسی خاص مسئلہ کے بارے میں سوال کیا ہو اور مفتی یہ محسوس کرے کہ اس کے سوال کو مزید اہم اور سودمند بنانے کے لئے اس میں کچھ اضافہ ضروری ہے تو وہ اپنے جواب میں اس طرح اضافہ کرے کہ سائل کا سوال بھی ضمناً آجائے اور جواب مفصل، جامع اور مفید تر ہو جائے۔ اگر اس طرح کیا جائے تو فتویٰ کے کمالات میں سے اور مفتی کے ذی علم ہونے کی دلیل وعلامت ہوگا۔ اسی طرح یہ اس بات کی بھی دلیل ہوگا کہ مفتی خیرخواہ ہے اور سائل کو اس نے بڑی خوش اسلوبی سے مطمئن کیا ہے۔ اس سلسلہ میں جو عمدہ مثال پیش

کی جا سکتی ہے وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ ارشاد ہے جو ایک سوال کو بیان کرنے کا بہترین انداز ہے فرمایا:

یَسْئَلُوْنَکَ مَا ذَا یُنفِقُوْنَ

اے نبی لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں؟

پھر اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ مِنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالاَقْرَبِیْنَ وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیْمٌ o (بقرہ: ۲۱۵)

"اے نبی ﷺ آپ فرما دیجیے کہ حسن سلوک کے طور پر تم جو مال بھی خرچ کرو تو وہ ماں باپ، قریبی رشتہ داروں، یتیموں، محتاجوں اور مسافروں کا حق ہے اور تم جو نیکی کرو تو بیشک اللہ اسے خوب جانتا ہے۔"

انداز جواب اور اسلوب دیکھیے کہ صرف اتنا بتا دینے کی بجائے کہ مسلمان کیا خرچ کریں؟ وہ تمام مصارف بھی بیان کر دیے ہیں کہ جہاں جہاں مسلمانوں کو خرچ کرنا چاہیے (۵۶) اور اس مخصوص سوال کا جواب بھی اللہ نے مختصراً اس طرح دے دیا "قُلِ الْعَفْوَ" آپ فرما دیجیے "جو آسان ہو۔"

منصب افتاء اور علماء کرام:

اللہ رب العزت نے اپنی کتاب عزیز میں ارشاد فرمایا ہے:

یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (مجادلۃ: ۱۱)

تم میں سے جو ایمان لائے اور جن کو علم دیا گیا اللہ ان کے درجات بلند فرمائے گا۔

نیز فرمایا:

نَرۡفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنۡ نَّشَآءُ وَفَوۡقَ كُلِّ ذِىۡ عِلۡمٍ عَلِيۡمٌ ۝ (یوسف: ۷۶)

ہم جس کے چاہتے ہیں درجات بلند کر دیتے ہیں اور علم والے کے اوپر اس سے بھی زیادہ علم والا ہے۔

مختلف عصور و ممالک میں علماء کرام جن مختلف درجات پر فائز رہے ہیں ان کے اعتبار سے اسلام کی تاریخ افتاء، مفتیوں کے کئی ایک نمونے پیش کرتی ہے اور اس کی وجہ مختلف ادوار میں فکر اسلامی میں انقلابات اور مد و جزر کا آنا ہے۔

پہلا نمونہ:

فقیہ کا نمونہ ہے ایک ایسا فقیہ جو اجتہاد کے تمام امور و معاملات سے آگاہ اور واقف ہے اللہ کی کتاب اور سنت رسول کا عالم ہے جو احکام میں اجتہاد مطلق کا امین ہے اور اس کا اجتہاد شریعت کے عام و خاص، اجمالی و تفصیلی دلائل سے عبارت ہے یہ ایک ایسا نمونہ ہے جسے مثالی اور درجہ اول کا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ جو مجتہدین کو حاصل ہے۔ جیسے آئمہ مذاہب اور فقہی مذاہب کے بانی علماء کرام۔

دوسرا نمونہ:

ایسے فقیہ کا نمونہ ہے جو مشہور فقہی مذاہب میں سے کسی ایک مذہب کو اختیار کرتا ہے پھر اپنے امام مذہب کی رائے کے مطابق ہی اجتہاد و فتویٰ کے راستہ پر گامزن ہے اسے اس بات کا یقین کامل ہے کہ اس کے امام نے جو کچھ کہا وہ صحیح ہے اور اس نے جو اصول و قواعد مرتب کئے وہ اصح تر ہیں۔ اگر اس کے پاس کوئی ایسے مسائل آ جاتے ہیں جن میں اس کے امام کا کوئی قول یا رائے نہ ہو تو وہ از خود اس میں اجتہاد سے نہیں گھبراتا بلکہ قیاس کے ذریعہ وہ اپنے امام کے اقوال کی روشنی میں نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کیونکہ اسے اپنے امام کا نکتہ نظر اور دلائل معلوم ہوتے ہیں۔ یہ نمونہ دوسرے درجہ میں ہے اور یہ بھی مجتہدین کے درجہ میں ہے جو ایک مذہب کے پابند اور اس میں رہتے ہوئے اجتہاد کرتے ہیں۔

تیسرا نمونہ:

یہ ایسے فقہ کا نمونہ ہے جو اپنے امام مذہب کے اقوال و فتاویٰ اور ان پر اس کے قائم کردہ دلائل پر چلتا ہے اور انہی پر قائم رہتا ہے۔

وہ کسی مسئلہ میں اس سے اختلاف نہیں کرتا اور کسی بھی مسئلہ میں اگر اسے امام کی رائے مل جائے تو اسی کو ترجیح دیتا ہے اور خود سے مسئلہ میں تحقیق کرنے کے چکر میں نہیں پڑتا بلکہ اسی پر اکتفاء کرتا ہے اور اس کا متبادل تلاش نہیں کرنا چاہتا کیونکہ وہ اپنے امام کے استنباط کردہ مسائل کو کافی سمجھتا ہے یہ نمونہ تیسرے درجہ میں آتا ہے۔ یہ اجتہاد اور تقلید کا درمیانی درجہ ہے۔

چوتھا نمونہ:

یہ ایسے فقیہ کا نمونہ ہے جسے متفقہ فی المذہب کہا جاتا ہے اور جو اپنے اوپر تقلید محض کو لازم کئے ہوئے ہے وہ امام اور اس کے اصحاب کے اقوال و فتاویٰ پر انحصار کرتا ہے اور امام مذہب کے بیان کردہ مسائل کو اصول و فروع میں پیش کرتا ہے جب کبھی اس سے کسی مسئلہ پر بات کی جائے اور اس کے سامنے کوئی دلیل پیش کی جائے تو وہ یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے کہ امام (فلاں) ہم سے زیادہ بہتر جانتے تھے اور ہم تو ان کی تقلید کرتے ہیں اور ان کے فیصلوں سے تجاوز نہیں کرتے۔ یہ نمونہ چوتھے اور آخری درجہ میں ہے۔ (۵۷)

اس تجزیہ سے ثابت ہوا کہ مفتی مقلد جو محض تقلید محض پر قائم ہو وہ دراصل حقیقی مفتیوں میں سے نہیں بلکہ وہ ان کا قائم مقام ہے اور ان کی نیابت کا فریضہ انجام دینے کی وجہ سے مفتیوں میں شمار ہے درحقیقت وہ اپنے امام اور مستفتیوں کے درمیان ایک واسطہ ہے۔

ابن القیم کہتے ہیں:

> ''ان کے علاوہ اگر کوئی فقیہ ہے تو وہ ایک (تھرڈ کلاس) خود ساختہ مفتی ہے جس نے اپنے آپ کو کام کے بندوں سے دور رکھا اور علماء کے درجہ تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکا ایسا شخص جاہلوں میں سے ایک ہے۔''

مفتی مقلد کس مذہب پر فتویٰ دے:

مذہبی امور پر غور کریں تو معلوم ہو گا کہ متفق علیہ یا مختلف فیہ مذہبی مسائل جو مدون یا مرتب ہو چکے ہیں حکم کے اعتبار سے پانچ طرح کے ہیں:

۱۔ ایسے مسائل جن میں اثبات حکم پر اتفاق ہے۔

۲۔ ایسے مسائل جن میں اکثر کے حکم کا اثبات اور کم کی نفی ہے اور وہ مذہب مشہور کہلاتا ہے پھر جس میں دلیل ہو وہ راجح قرار پاتا ہے۔

۳۔ ایسے مسائل جن میں اثبات اور نفی کے دو قول ہوں اور برابر حیثیت کے ہوں۔

۴۔ ایسے مسائل جن میں اثبات کا حکم کم اور نفی کا اکثر ہو ایسے مسائل کو مرجوح کہتے ہیں جو راجح اور مشہور کے مقابل ہے۔

۵۔ ایسے مسائل جن میں ایک یا دو نے اثبات کا حکم لگایا ہو اور باقیوں نے نفی کا، اسے شاذ کہتے ہیں۔

ان پانچ اقسام میں سے معاملات اور حقوق العباد میں فتویٰ دینا جائز ہے بشرطیکہ قول متفق علیہ، قول مشہور یا راجح ہر طرح سے برابر نوعیت کے ہوں اور ان میں ترجیح ممکن نہ ہو تو دو قولوں میں سے کسی ایک کے مطابق فتویٰ دیا جا سکتا ہے اور مرجوح قول پر صرف کسی ضروریات یا مصلحت کی بناء پر فتویٰ دیا جا سکتا ہے یا کسی امام کے کسی قول کی پہلے سے قائم ترجیح کے مطابق فتویٰ دیا جا سکتا ہے۔

قول شاذ پر فتویٰ نہیں دیا جا سکتا اور اگر کوئی قول شاذ پر فتویٰ دے تو اس سے باز پرس کی جائے گی الا یہ کہ عدلیہ کے قاضی حضرات اور مفتی کے منصب پر فائز اہل علم اس بات کی تصدیق کریں کہ قول شاذ پر دیا گیا فتویٰ مخصوصہ قابل عمل ہے۔ ایسی صورت میں یہ فتویٰ قول مشہور سے بھی مقدم ہو گا باوجودیکہ بنیادی طور پر وہ قول شاذ پر ہے۔ شرط یہ ہے کہ تصدیق کنندگان ایسے عادل اور ثقہ اہل علم ہوں جن کی فقہی امور میں پیروی کی جاتی ہو اور جنہیں فقہی معاملات کا خاصا تجربہ ہو۔ جب کبھی بھی قول شاذ پر دیئے گئے فتویٰ کو ناقابل عمل یا منسوخ قرار دیا جائے گا تو خود بخود اس کے تمام دلائل بھی ناقابل عمل ہوں گے اور لائق

اعتبار نہ رہیں گے اور قول مشہور کی طرف از سرنو رجوع کرنا ہوگا۔ (۵۸)

التسولی نے القرافی کا ایک قول بیان کیا ہے کہ

"مجتہد کو قول راجح کے سوا فتویٰ دینا جائز نہیں جبکہ مقلد کے لئے جائز
ہوگا کہ وہ اپنے مذہب میں قول مشہور پر فتویٰ دے اگرچہ وہ قول خود
اس کی نظر میں راجح نہ ہو۔"

یہ اس لئے کہ اس پر اپنے امام کی پیروی لازمی ہے۔ البتہ ابن القیم کا خیال یہ ہے کہ مفتی کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنے اعتقاد اور یقین کے خلاف فتویٰ دے البتہ صحیح اور صواب یہ ہے کہ وہ اپنے مذہب کے قول راجح ہی کو بیان کرے کیونکہ اس پر عمل کرنا ہی اولیٰ اور افضل ہے۔ (۵۹) امام الجوینی نے کہا ہے کہ "کسی مفتی کو اپنے امام مذہب کے قول کے بغیر فتویٰ دینا جائز نہیں۔ ہاں مگر یہ کہ وہ کسی دوسرے مذہب میں بھی ید طولیٰ رکھتا ہو اور اس کے تمام اسرار و رموز سے واقف و آگاہ ہو۔ (۶۰)

اگر کسی مفتی نے فتویٰ دیا اور فتویٰ صادر ہو جانے کے بعد اس پر واضح ہوا کہ یہ اس کے امام مذہب کی نصوص کے خلاف ہے تو مقلد ہونے کی صورت میں اسے فوراً اس سے رجوع کر لینا چاہئے کیونکہ اس کے امام مذہب کی بات اور دلیل اس کے لئے وہی حکم رکھتی ہے جو کسی مجتہد بالذات کے لئے نص شارع (۶۱) ہاں اگر اس پر یہ واضح ہو جائے کہ اس کے امام کی رائے مخالف نص اور اجماع ہے یا قیاس جلی کے خلاف ہے تو ایسی صورت میں امام کی رائے پر فتویٰ دینا حرام ہے اور اس سے اس کے امام کی شان میں کوئی کمی بھی واقع نہیں ہوتی۔ کیونکہ اجتہاد میں خطا واقع ہونے سے گناہ لازم نہیں آتا جیسا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"حاکم اگر اجتہاد کرے اور اس میں غلطی کر بیٹھے جب بھی اسے ایک
اجر ملتا ہے اور اگر وہ اجتہاد کرے اور صحیح حل تک پہنچنے میں کامیاب ہو
جائے تو اس کے لئے دوہرا اجر ہے۔" (۶۲)

تاہم ایسی معمولی باتیں جن کے بارے میں مذہب (مخصوص) میں کوئی نص نہ ہو

تو ان میں پہلی بار ہی تحقیق کرنا ہوگی اور مفتی کے لئے امام یا اس کے اصحاب سے اقوال منصوصہ سے ہٹ کر بحث و تحقیق اور تخریج جائز ہوگی جبکہ اسے اپنے امام مذہب کے قواعد و ضوابط کا علم ہو اور ان تمام دلائل و قیاسات سے واقف ہو جن سے امام مذہب نے کام لیا ہے اور اگر اس میں یہ استعداد نہ ہو تو پھر بلاوجہ وہ اس بکھیڑے میں نہ پڑے جس کا وہ اہل نہیں۔
القرافی کہتے ہیں:

> ''مفتی کو چاہئے کہ اگر اس کے سامنے کوئی ایسا مسئلہ آجائے جس کے بارے میں نص نہ ہو تو اسے چاہئے کہ وہ اجماع کے قواعد پر غور و فکر کر کے دیکھے کہ اس کی جو صورت نکلتی ہوئی نظر آتی ہے اس میں اور اصل میں کیا فرق ہے؟ اگر اسے معلوم ہو کہ اصل اور صورت مخرجہ میں بہت زیادہ فرق واقع ہو رہا ہے تو تخریج مسئلہ سے اجتناب کرے کیونکہ قیاس مع الفارق باطل ہے جس طرح کسی مجتہد کے لئے قواعد شرع پر قیاس مع الفارق ممنوع ہے اسی طرح کسی مقلد کا قیاس مع الفارق درست نہیں۔ چنانچہ کسی مفتی کیلئے جائز نہیں کہ وہ کسی غیر منصوص کو منصوص پر مقدم جانے یا ترجیح دے ماسوائے اس صورت کے کہ اسے اپنے مذہب کے قواعد اور اجماع کے ضوابط پر کامل دسترس ہو۔'' (۶۳)

مفتی کے ان امور میں ضعف کے باعث اسے تخریج سے منع کیا جائے۔ مفتی کے لئے ممکن ہے کہ اگر وہ تخریج و ترجیح کا اہل نہ ہو تو وہ ان آئمہ کے ذاتی اوصاف میں غور کر کے یہ نتیجہ نکالے کہ ان میں کس کی رائے قابل ترجیح ہو سکتی ہے۔ پھر ان میں سے بڑے عالم، متقی اور عمر رسیدہ کی رائے کو ترجیح دے اور اگر تمام ایک دوسرے سے بعض اوصاف کے اعتبار سے ممتاز ہوں تو پھر ترجیح اس کو دے جو زیادہ صائب الرائے ہو ایسا بڑا عالم مقدم ہوگا جو متقی بھی زیادہ ہو بنسبت اس زیادہ متقی کے جو عالم ہو۔ ترجیح کا یہ اصول اسی طرح ہے جس طرح احادیث میں راویوں کو ترجیح دینے کے سلسلہ میں اس وقت کیا جاتا ہے جب تعارض روایات پیش آئے۔ (۶۴)

مفتی مقلد اپنے مذہب کی کن کتب پر اعتماد کرے:

مفتی کو چاہئے کہ وہ ایسی کتابوں سے فتوئی نہ دے جو غیر مشہور وگمنام ہوں یا جن کے مندرجات کی صحت کا کوئی ثبوت نہ ہو۔ اس طرح ایسی نئی کتابیں جن میں منقول عبارات کا کتب معتبرہ سے منقول ہونا ثابت نہ ہو یا جن کے مصنفین کی عدالت وثقاہت کا یقین نہ ہو۔ اس طرح اگر نفس حکم ان کتب کے حواشی یا تعلقات سے ثابت ہو اور وہ بھی نامعلوم اصل سے منقول ہوں اور امہات الکتب میں وہ حکم نہ پایا جائے نہ ان کے حوالہ جات مذکور ہوں نہ وہ واضح خط سے تحریر کردہ ہوں تو ایسی عبارات سے فتاویٰ میں استدلال درست نہیں۔

تاہم ایسی کتب مشہورہ جو علماء کے ہاں معروف ہوں اور جن کے بارے میں علماء کی تصدیق موجود ہو کہ ان میں کوئی تحریف یا ردو بدل نہیں ہوا ہے تو ایسی کتب سے فتوئی دینا جائز ہے اگرچہ اصول تو یہ ہے کہ فتوئی ایسی کتب سے دیا جائے جن کو ثقہ اور عادل علماء نے روایت کیا ہو اور ان سے اس مجتہد نے اکتساب کیا جس کا یہ مفتی مقلد ہے تاکہ اس کے لئے ان کتب کی صحت ایسی بے غبار ہو جائے جیسے مجتہد کے لئے احادیث کی۔ کیونکہ ہر دو صورتوں میں اللہ کے دین کو نقل کرنا مقصود ہے مگر لوگوں نے اس معاملہ میں وسعت پیدا کر لی ہے اور متقدمین کی ایسی کتب مشہورہ سے اخذ کو جائز قرار دیا ہے جن میں رواۃ کا سلسلہ اگرچہ مذکور نہ ہو جیسا کہ نحو اور عربی زبان کی کتابوں میں سند اور رواۃ کا سلسلہ متروک ہو چکا حالانکہ عربی کی کتابیں ہی کتاب وسنت کی اساس ہیں۔ اسی طرح فقہ کی کتابوں میں بھی سلسلہ رواۃ کا ذکر اب غیر ضروری سمجھ کر ترک کر دیا گیا ہے کیونکہ یہ اطمینان ہو چکا کہ ان میں کوئی تحریف ہوئی ہے اور نہ ردو بدل۔ (۶۵)

علامہ عزالدین ابن عبدالسلام سے مفتی مقلد کے بارے میں پوچھا گیا جو ایسے قول سے فتوئی دیتا ہو جس کی نسبت اس کے امام مذہب کی طرف ہے اور اس مفتی نے روایت کے اصولوں کے مطابق یہ قول اپنے امام مذہب سے نہیں لیا بلکہ صرف امام مذہب کی کتب کے مطالعہ سے حاصل کیا ہے تو کیا یہ ایسے قول کو فتوئی میں پیش کر سکتا ہے؟ اس کے جواب میں علامہ نے کہا:

''فقہ کی صحیح کتب پر اعتماد کرنا جن کی توثیق ہو چکی، علماء عصر کے ہاں متفق علیہ ہے کیونکہ ان کتابوں کو ایسی ہی ثقاہت حاصل ہو چکی ہے جیسی سند و روایت کو حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح لوگوں نے نحو، لغت، طب اور دیگر تمام علوم کی مشہور کتابوں پر اعتماد کیا ہے کیونکہ انہیں بھی ثقاہت و اعتماد کی سند مل چکی اور ان میں رد و بدل کا خدشہ بعید از قیاس قرار پا چکا ہے۔ اب جو کوئی یہ سمجھے کہ لوگوں نے ان کتابوں پر اعتماد کر کے غلطی کی ہے تو وہ خود غلطی پر ہے کیونکہ اگر اس اعتماد کا جواز نہ ہو تو بہت سے معاملات جن کا تعلق طب، نحو اور عربی زبان کے حوالہ سے شریعت سے ہے وہ سب معطل ہو کر رہ جائیں۔ شریعت بہت سی صورتوں میں اطباء کے اقوال سے رجوع کرتی ہے جبکہ طب کی زیادہ تر کتابوں کا تعلق قوم کفار سے ہے لیکن جب ان کتابوں میں وضع و تدلیس کا امکان نہیں اور ان پر اعتماد ہو چکا جیسا کہ اشعار میں ہے کہ عرب کے کافر شعراء کے کلام پر اعتماد کیا گیا۔ اسی طرح ان پر بھی اعتماد کا معاملہ ہے۔'' (٦٦)

الزرکشی نے ابو اسحاق السفرائنی سے نقل کیا ہے (٦٧) کہ:

''انہوں نے معتمد کتابوں سے نقل کرنے کے جواز پر اجماع بیان کیا ہے اور اس میں مؤلف تک اتصال سند کی شرط بھی عائد نہیں کی۔''

ابن الصلاح نے کہا ہے کہ:

''اگر کسی کتاب کے کسی نسخہ کی صحت کا یقین ہو تو یوں کہنا چاہیے ''فلاں نے یوں کہا ہے'' ورنہ کسی کے قول کو یونہی لفظ یقین کے ساتھ بیان نہ کرنا چاہیے۔''

امام سیوطی نے اس کی تاکید کرتے ہوئے لکھا ہے:

''آج کل لوگ کتب سے نقل کرتے ہیں اور منقولہ عبارات کی نسبت ان کے مصنفین کی طرف ظاہر کرتے ہیں۔'' (٦٨)

اسی طرح کسی بھی فقہی مذہب کی کتب معتمدہ سے فتوی دینے کے جواز پر اتفاق ہے۔ اگرچہ براہ راست ان کے مصنفین سے روایت نہ بھی لی گئی ہو۔ علامہ عزالدین بن عبدالسلام، شہاب الدین القرافی، برہان الدین ابن فرحون، بدرالدین الزرکشی، جلال الدین السیوطی اور ابو اسحاق اسفرائنی نے اس پر اجماع بیان کیا ہے۔

عامی کا عامی کو فتویٰ دینا:

کیا کسی عام آدمی کے لئے جائز ہے کہ وہ کسی عام آدمی کو ان معلومات کی بناء پر فتوئ دے دے جو اس نے علماء سے سنی یا حاصل کی ہوں؟ یہ سوال ایک سے زائد علماء اور کبار فقہاء نے چند مسائل کے حل کے سلسلہ میں اٹھایا ہے اور اس کے جواب میں جو اقوال سامنے آتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

پہلا قول:

یہ مکمل ممانعت کا قول ہے صاحب ''الحاوی'' کی رائے میں یہی صحیح تر ہے کیونکہ عام آدمی میں استدلال کی صلاحیت نہیں ہوتی اور نہ اسے شرائط استدلال کا علم ہوتا ہے اور وہ کسی ایسی بات کو دلیل خیال کرتا ہے جو کہ دراصل دلیل نہیں ہوتی۔

دوسرا قول:

یہ جواز کا قول ہے۔ بشرطیکہ مسئلہ کی دلیل قرآن وسنت سے ہو اور اگر ان دونوں کے علاوہ دلیل ہو تو جائز نہیں کیونکہ کتاب وسنت کے مخاطب تو سبھی لوگ ہیں تو جس طرح ایک شخص پر لازم ہے کہ اسے کتاب وسنت کا جو حکم پہنچا ہو وہ اس پر عمل کرے اسی طرح کسی دوسرے کو قرآن وسنت سے رہنمائی فراہم کرنا اور اس سے آگاہ کرنا بھی اس کیلئے جائز ہے۔

قول ثالث:

یہ جواز مطلق کا ہے کیونکہ عام آدمی کے پاس بھی علم اس واقعہ کی دلیل کے ساتھ

اس طرح پہنچا ہے جس طرح کہ ایک عالم کے پاس۔ اگر کوئی عالم اس وجہ سے ممتاز ہے کہ اس کے پاس علمی مہارت وملکہ ہے جس کی بناء پر وہ کسی دلیل پر قائم رہتا اور دلیل مخالف کو رد کر سکتا ہے تو عام آدمی کے پاس بھی تو دلیل اور علم ہی ہے، اس کی تائید میں ابن القیم کہتے ہیں:

"یہ تو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے پیغام پہنچانے کا سلسلہ ہے پس جو کوئی بھی یہ کام کر کے اسلام کا مددگار بنے اللہ اس کو جزائے خیر دے۔ اگرچہ ایک کلمہ خیر ہی کی تبلیغ کیوں نہ ہو۔"

انہوں نے اس مسئلہ میں اپنی تعلیق ان الفاظ پر ختم کی ہے۔

"کسی عام آدمی کو ایسا شرعی مسئلہ بتانے سے روکنا جو وہ جانتا ہے خطائے محض ہے۔ اللہ توفیق بخشے۔" (۶۹)

مفتی کی ادبی اور مادی ذمہ داریاں:

مفتی کی اخلاقی اور ادبی ذمہ داری سے کسی کو اختلاف نہیں کیونکہ فتویٰ دراصل اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تبلیغ پیغام ہے۔ اس سلسلہ میں مفتی کی ذمہ داری انتہائی اہم ہے۔ کیونکہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے بولتا ہے۔ جب وہ یہ کہتا ہے کہ اللہ نے یوں حکم دیا ہے یا اس طرح منع کیا ہے یا اللہ نے یوں واجب قرار دیا ہے اور یوں حرام ٹھہرایا ہے۔ (۷۰) اسی بنیاد پر ابن القیم نے اپنی معروف کتاب فتویٰ وقضاء کا نام "اعلام الموقعین عن رب العالمین" رکھا ہے۔

مفتی پر ادبی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ مادی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے اور وہ یوں کہ امام یا حاکم مفتی سے کوئی فتویٰ لے کر اس کے مطابق کوئی حکم نافذ کرتا ہے اور اگر بعد میں یہ معلوم ہو کہ مفتی سے فتویٰ میں سہو ہو گیا تو اس صورت میں اس فتویٰ پر عمل کے نتیجہ میں اگر کوئی مالی نقصان ہو تو مفتی اس کا ضامن ہوگا اگر فتویٰ حکم حاکم یا طلب امام کی بناء پر نہ دیا گیا ہو اور اس سے کوئی مالی یا جانی نقصان ہو جائے تو پھر دیکھا یہ جائے گا کہ فتویٰ دینے والا مفتی، فتویٰ دینے کا مجاز تھا یا نہیں؟ اگر وہ مجاز اور اہل تھا تو اس صورت میں ضمان مستفتی

(سائل) پر ہے کیونکہ اسے اختیار تھا کہ وہ مفتی کے فتویٰ پر عمل کرے یا نہ کرے وہ مفتی کے فتویٰ پر عمل پیرا ہونے کا پابند نہ تھا اور اگر مفتی غیر مجاز اور نااہل تھا تو ضمان اسی پر ہوگی نہ کہ مستفتی پر۔ یہ مسئلہ نبی اکرم ﷺ کے اس ارشاد کی روشنی میں ہے کہ:

''جو کوئی علم طب نہ جانتا ہو اور طبیب بن بیٹھے تو وہ کسی بھی نقصان کا ذمہ دار (ضامن) ہوگا۔'' (۷۱)

یہ حدیث سنن ابوداؤد، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ میں موجود ہے۔ ابراہیم اللقانی کی کتاب اصول فتویٰ میں ''ضمان المفتی'' کے عنوان سے لکھا ہے:

''ہمارے علماء نے کہا ہے کہ اگر مفتی کے فتویٰ سے کسی کا مال تلف ہو گیا اور مفتی مجتہد تھا تو اس پر کوئی غبار نہیں اور اگر مجتہد نہ تھا تو وہ نقصان کا ضامن ہے۔''

المازری نے کہا کہ:

''مفتی کے فتوے سے (جبکہ وہ مجتہد نہ ہو) اگر کوئی نقصان ہو جائے تو حاکم کو چاہئے کہ وہ اس کو تنبیہ کرے اور وہ نقصان کا ضامن بھی ہوگا پھر اگر تنبیہ کے بعد وہ اہلیت فتویٰ حاصل کر لے تو اسے سزا نہ دی جائے اور اگر وہ پھر بھی اہلیت حاصل نہ کرے تو اسے فتویٰ دینے سے منع کر دیا جائے۔ (۷۲)

علامہ محمد مکی الناصری کی اس تحریر سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ فتویٰ نویسی ہر کہہ و مہ کا کام نہیں بلکہ یہ انتہائی ذمہ دارانہ منصب ہے مگر اس کا کیا کیا جائے کہ ہمارے ملک میں نہ تو مفتی کی اہلیت سے متعلق کوئی جانتا ہے نہ اس منصب کی نزاکت سے کوئی واقف و آگاہ ہے۔ بلکہ جس کا جی چاہے مفتی ہونے کا اعلان کر دے اور راتوں رات مفتی بن بیٹھے۔ علماء کرام کو بالخصوص اہل علم و دانش کو چاہئے کہ وہ کوئی ایسا نظام قائم کریں جس کے تحت مفتی کا منصب صرف قابل اور اہل لوگوں کے لئے مختص ہو سکے اور ملک میں خودساختہ مفتیوں کی وجہ سے پھیلی ہوئی مسلکی انارکی کا خاتمہ ممکن ہو۔

حواشی

۱۔ آیات ۱۸۹، ۲۱۵، ۲۱۷، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۲ سورۃ البقرۃ۔

۲۔ آیت نمبر ۴ سورۃ المائدۃ۔

۳۔ آیت نمبر ۱ سورۃ الانفال۔

۴۔ آیت نمبر ۱۲۷، ۱۷۶ سورۃ النساء۔

۵۔ ابن العربی، احکام القرآن، جلد ۱، ص ۵۰۳۔

۶۔ ابو حیان، تفسیر ابی حیان، جلد ۳، ص ۳۵۹۔

۷۔ فخر الدین رازی، تفسیر کبیر، جلد ۶، ص ۴۰۸۔

۸۔ ابراہیم اللقانی، اصول الفتویٰ، ص ۴۳، ۴۴ (غیر مطبوعہ)

۹۔ القرافی، الفروق، جلد ۲، ص ۱۱۰۔

۱۰۔ النووی، المجموع، جلد ۱، ص ۴۱۔

۱۱۔ التسولی علی التحفۃ، جلد ۱، ص ۴۵۔ بحوالہ فتاویٰ عالمگیری۔

۱۲۔ ادب الفقیہ والمتفقہ، ج ۲، ص ۱۵۲۔

۱۳۔ ابن قیم، اعلام الموقعین، ج ۴، ص ۱۸۹۔

۱۴۔ التسولی علی التحفۃ، جلد ۱، ص ۴۵۔ بحوالہ فتاویٰ عالمگیری۔

۱۵۔ القرافی، الاحکام فی التمیز بین الفتاویٰ والاحکام، ص ۲۶۶۔

۱۶۔ الحصکفی، در المختار، ج ۴، ص ۴۸۔

۱۷۔ ابن قیم، اعلام الموقعین، ج ۴، ص ۱۹۲۔

۱۸۔ النووی" المجموع، ج ۱، ص ۴۲۔

۱۹۔ ابن قیم، اعلام الموقعین، ج ۴، ص ۱۹۲۔

۲۰۔ ایضاً، ج ۴، ص ۱۷۴۔

۲۱۔ ایضاً، ج ۴، ص ۱۹۱، والموافقات للشاطبی، ج ۴، ص ۱۷۲۔

۲۲۔ ابراہیم اللقانی، اصول الفتویٰ، ص ۸۷، (مخطوطہ)

۲۳۔ ابن القیم اعلام الموقعین، ج ۴، ص ۱۵۰۔

۲۴۔ القرافی، الاحکام فی التمیز بین الفتاوی والاحکام، ص ۲۷۱۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۲۵۲۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۲۴۹۔

۲۷۔ ابن القیم اعلام الموقعین، ج ۴، ص ۱۶۳۔

۲۸۔ القرافی، الاحکام، ص ۲۵۹۔

۲۹۔ ایضاً، ج ۴، ص ۱۶۳، ۱۶۷، ۱۶۹۔

۳۰۔ ایضاً، ص ۲۵۷۔

۳۱۔ النووی، المجموع، ج ۱، ص ۴۱۔

۳۲۔ القرافی، الاحکام، ص ۲۶۹۔

۳۳۔ ابن فرحون، التبصرۃ، ج ۱، ص ۵۱، نیز ابن القیم، اعلام الموقعین، ج ۴، ص ۱۹۳، النووی، المجموع، ج ۱، ص ۴۶، التسولی، ج ۱، ص ۲۴۔

۳۴۔ ابن القیم، اعلام الموقعین، ج ۴، ص ۱۸۳۔۱۸۴۔

۳۵۔ النووی، المجموع، ج ۱، ص ۵۰ بحوالہ الضمیری۔

۳۶۔ النووی، المجموع، ج ۱، ص ۴۱، ابن القیم، اعلام الموقعین، ج ۴، ص ۱۹۸۔

۳۷۔ ابن القیم، اعلام الموقعین، ج ۴، ص ۱۷۸ نیز اللقانی اصول الفتویٰ قلمی ص ۸۴۔

۳۸۔ النووی، المجموع، ج ۱، ص ۴۶۔

۳۹۔ ابن القیم، اعلام الموقعین، ج ۴، ص ۱۵۳۔

۴۰۔ ایضاً، ص ۱۹۸۔

۴۱۔ ابو البقاء، کلیات، ص ۳۴۸۔۳۶۹۔

۴۲۔ النووی، المجموع، ج ۱، ص ۵۷۔

۴۳۔ القرافی، الاحکام، ص ۲۸۲۔۲۸۳، ابن القیم، الاعلام، ج ۴، ص ۱۹۳، النووی، المجموع، ج ۱، ص ۴۵۔

۴۴۔ النووی، المجموع، ج ۱، ص ۵۷۔

۴۵۔ ابن القیم، الاعلام، ج ۴، ص ۱۵۴۔

۴۶۔ القرافی، الاحکام، ص ۲۵۷، ۲۶۶، ۲۶۸۔

۴۷۔ النووی، المجموع، ج ۱، ص ۵۲۔

۴۸۔ القرافی، الاحکام، ص ۲۶۹۔
۴۹۔ ابن القیم، اعلام الموقعین، ج ۴، ص ۱۴۰۔۱۴۱۔
۵۰۔ ایضاً، ج ۴، ص ۱۳۸۔
۵۱۔ القرافی، الاحکام، ص ۲۵۱۔۲۵۴۔۲۶۴
۵۲۔ ایضاً، ص ۲۵۱، الطبرانی، المعجم الکبیر، والسیوطی، المعجم المصغیر۔
۵۳۔ ابن القیم، الاعلام، ج ۴، ص ۱۴۲۔۱۴۳۔
۵۴۔ ایضاً، ج ۴، ص ۱۳۹۔
۵۵۔ ایضاً، ج ۴، ص ۱۴۸۔
۵۶۔ ایضاً، ج ۴، ص ۱۳۷۔
۵۷۔ ایضاً، ج ۴، ص ۱۸۴۔۱۸۵۔۱۸۶۔۱۸۷، وابن رشد، المختصر، ج ۶، ص ۹۴۔
۵۸۔ التسولی علی التحفہ، ج ۱، ص ۲۵۔
۵۹۔ ابن القیم، الاعلام، ج ۴، ص ۱۵۴۔
۶۰۔ ایضاً، ج ۴، ص ۱۷۰۔
۶۱۔ النووی، المجموع، ج ۱، ص ۴۵۔
۶۲۔ القرافی الفروق، ج ۲، ص ۱۰۹۔
۶۳۔ القرافی، الاحکام، ص ۲۶۰، والفروق، ج ۲، ص ۱۰۷۔
۶۴۔ ابن الصلاح بحوالہ ابن فرحون، التبصرۃ، ج ۱، ص ۵۰۔۵۱۔
۶۵۔ القرافی، الاحکام فی تمیز الفتاویٰ عن الاحکام، ص ۲۶۱۔۲۶۲
۶۶۔ ابن فرحون، التبصرۃ، ج ۱، ص ۵۳۔۵۴، السیوطی، الاشباہ والنظائر، ص ۲۴۷۔
۶۷۔ شیخ زین الدین بن ابراہیم ابن نجیم، الاشباہ، والنظائر، ص ۳۴۶۔
۶۸۔ شیخ زین الدین بن ابراہیم ابن نجیم، الاشباہ، والنظائر، ص ۳۴۶۔
۶۹۔ النووی، المجموع، ج ۱، ص ۴۵، ابن القیم، الاعلام، ج ۴، ص ۱۷۳۔۱۸۸
۷۰۔ الاعلام، ابن القیم، ج ۱، ص ۱۶۴۔
۷۱۔ ایضاً، ج ۴، ص ۱۹۶۔۱۹۷
۷۲۔ ایضاً، ج ۴، ص ۱۹۷۔

پروفیسر ڈاکٹر نور احمد شاہتاز صاحب کی دیگر کتب ورسائل

- تاریخ نفاذ حدود
- کاغذی کرنسی کی شرعی حیثیت
- کریڈٹ کارڈ کی شرعی حیثیت
- کلوننگ (کا تعارف، شرعی حیثیت)
- امام وخطیب کی شرعی ومعاشرتی حیثیت
- مختصر نصابِ سیرت
- مختصر نصابِ فقہ
- مختصر نصابِ قرآن
- مختصر نصابِ حدیث
- انڈکس شرح صحیح مسلم
- روزہ رکھے، مگر۔۔۔؟
- قربانی کیسے کریں
- لوگ کیا کہیں گے
- شیئرز کے کاروبار کی شرعی حیثیت
- کڑوی روٹی
- بینکوں کے ذریعہ زکوٰۃ کی کٹوتی
- پندرھویں صدی کا مجدد کون
- اسلامی بنکاری
- رطب ویابس (مجموعہ مقالات)
- بچوں کے لئے دعائیں
- مفتی کون فتویٰ کس سے لیں
- پی ایچ ڈی کیسے کریں؟
- لیزنگ (اجارہ)
- چند منتخب امور ومعاملات کی شرعی حیثیت
- تعارف قادیانیت اور مسئلہ ختم نبوت
- جدید فقہی مسائل اوران کا مجوزہ حل